نیرنگ خیال
جون ۱۹۳۸

دلہن کا سنگار — امرت شیر گل کی مصوری کا ایک نمونہ

امرت شیر گل
ایک مشہور مصورہ

بلبلے — آدمی بلبلہ ہے پانی کا

نرگس
جو ان دنوں رومیو
جولیٹ میں کام کر
رہی ہے۔

رشید دلہن
سنو ٹون لمیٹڈ لکھنو کا
تازہ شاہکار

غازی عصمت انونو - صدر جمہوریہ ترکی
جنھوں نے امریکہ اور انگلستان سے
اتحاد کر لیا ہے

چندہ سالانہ
۶ روپے
قیمت فی پرچہ
۸ آنے

نیرنگِ خیال لاہور

چیف ایڈیٹر
حکیم
یوسف حسن

اُردو ادب میں یگانہ صفت ماہنامہ جو ۲۳ سال سے جاری ہے

جلد ۴۸ بابت ماہ جون ۱۹۴۷ء نمبر ۶

مقالات

خودی اور بیخودی .... از جناب میر محمود علی بادشاہ ایم. اے میسور ..
علامہ شفیق جون پوری .... از حضرت خیال لکھنوی ....
مشاعرہ شاعر .... از جناب محمد عثمان صاحب مظفر گڑھی ..

معراج .... از جناب انعام کبریا. بی. اے ...
چیخوف کے خطوط .... از حضرت وصی صدیقی ....

افسانے

قتل کا مقصد .... از یوسف حسن ....
سیاسی جنون .... از مس اُلفت منہاس بی اے. بی. ٹی ...
افتادِ طبیعت .... جناب جبریل جبل پوری کے قلم سے ....
پارک .... اکالی گور بخش سنگھ ....
کشمیر کے مرغزاروں میں .... محترمہ حسن آرا قریشی ....

نظمیں

حضرت جلیل قدوائی، حضرت شرقی خالدی۔ نوشاد نوندی
جناب ثاقب سلمانی، حضرت فاروق محشر بدایونی۔ جناب پرواز جعفری

اسکندریہ سے ایک خط

ذیل کا خط اسکندریہ سے ایک ہندو دوست مالک رام صاحب نے ایک مسلمان دوست حضرت جلیل قدوائی صاحب کو حال ہی میں بھیجا ہے۔ ہم نے نیرنگِ خیال" میں اشاعت کے لئے جلیل صاحب سے یہ خط مانگ لیا ہے۔

اس خط سے نہ صرف اُردو کی اس ہمہ گیری کا ثبوت ملتا ہے۔ جس کی بنا پر اسے ہندوستان کی لنگوا فرینکا کہا جاتا ہے۔ بلکہ آج کل کے زمانے میں جبکہ برادران وطن نے زبان کے جھگڑے کو فرقہ وارانہ مسئلہ بنا کر قدیم فارسی و عربی الفاظ کے اخراج کی تحریک شروع کر دی ہے۔ یہ بھی ثبوت ملتا ہے کہ رچی بسی ہوئی اُردو نہ کہ موجودہ مصنوعی زبان جسے فرقہ وارانہ ذہنیت وجود میں لانا چاہتی ہیں، کیا ہندو کیا مسلمان سب کی عام زبان تھی اور ہے۔ اور اخراج الفاظ کی کوشش ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی۔

سب سے بڑی بات اس خط میں یہ ہے کہ ملک میں بے امنی اور ہندو مسلم فسادات کے زمانے میں بھی ان ہر دو دوستوں کے تعلقات نہ صرف اسی طرح دوستانہ ہیں، بلکہ ہندو مسلم مشترکہ تہذیب جسے خالص ہندی تہذیب کہنا چاہیے ہر ہر سطر میں حتیٰ کہ ہندو دوست کی اولاد کے نام سے بھی عیاں ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہم اپنے ناظرین کی خدمت میں خاص طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔

(ایڈیٹر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲ مئی ۱۹۴۷ء

دفتر ٹریڈ کمشنر ہندوستان، اسکندریہ

حضرت المکرم جناب جلیل قدوائی مدظلہٗ

آداب نیاز۔ امید ہے میرا عریضہ جو میں نے آپ کو دہلی سے لکھا تھا بخیریت ملاحظہ سے گزرا ہوگا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں پنجاب میں واپسی پر حاضر خدمت ہونگا لیکن بد قسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ میں ابھی دہلی ہی میں تھا، کہ پنجاب میں فسادات شروع ہو گئے۔ پہلے لاہور پھر امرتسر، جالندھر، ملتان، ملوال، راولپنڈی تک یہ وبا پھیل گئی۔ اوّل تو مجھے دہلی ہی میں توقع سے زیادہ دن لگ گئے۔ واپس پہنچا تو گجرات کے ضلع میں حالات اتنے خطرناک تھے کہ فوراً اہل و عیال کو وہاں سے نکالنے کی فکر ہوئی۔ کچھ نہ پوچھئے کہ دن کس بے اطمینانی سے بسر ہوئے۔ بہر حال اب ان ناخوشگوار حالات کے بیان سے سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن باور کیجئے کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکنے کا سخت افسوس ہوا۔ میری رخصت ۵ اپریل تک تھی اور میرے پاس کافی دن تھے لیکن پنجاب کی بے امنی نے سارا پروگرام تہ و بالا کر دیا۔ خیر یار زندہ صحبت باقی۔ لیکن جب تک ملاقات نہیں ہوتی کیا آپ نے اپنے اوپر لازم نہیں کر لیا کہ ہم مہینے میں زیادہ [illegible]

نئی دہلی سے آپ کو احسن الانتخاب میں شائع شدہ اسی خط کیلئے لکھا تھا، جو غالب نے اخبار میں اس معذرت کے ساتھ شائع کیا تھا کہ اب میں کمزور اور کہن سال ہو گیا ہوں اس لئے احباب کے خطوط کے جواب اور اشعار کی اصلاح کے فرض کو کما حقہ ادا نہیں کر سکتا اس لئے دوست آئندہ مجھے اس تکلیف سے معاف رکھیں۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ احمد حسن صاحب آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے تھے۔

کیا آپ یہ رقعہ نقل کر کے بھیج سکتے ہیں۔ شکریہ

میں جب ہندوستان سے روانہ ہوا ہوں تو خدا کے فضل سے دو بچیاں تھیں اوشا اور ارونا۔ گزشتہ آٹھ برس ہوا اس نے اپنے فضل سے تین بچے اور دئیے۔ ایک لڑکی اور دو لڑکے۔ بشریٰ، آفتاب اور سلمان عربی نام ہیں اور آفتاب تو ظاہر ہے کہ فارسی ہے۔ دعا کریں کہ قادر مطلق انہیں عمر دراز، نیک نام اور نیک انجام کرے آمین۔ تینوں بڑی لڑکیاں سکول جاتی ہیں۔ جن دنوں میں دہلی میں تھا یا شملہ بیگم جلیل مجھ بیمار تھیں۔ لکھئے کہ اب وہ کیسی ہیں اور کے بچے ہیں۔ کیا نام ہیں۔ تاکہ معلوم ہو کہ اللہ کے فضل سے کتنے بھتیجے بھتیجیاں ہیں۔ سب کو دعا اور پیار۔ اور گھر میں سلام مسنون عرض کریں۔ زیادہ فی الحال کیا لکھوں۔ جواب کی زحمت گوارا فرمائیں۔ والسلام مع الاکرام

خاکسار

مالک رام

انقلاب

نوشاد نوری، پٹنہ

مہتاب کی کرنیں گنگا پر تنویر کے جال بچھاتی تھیں
مستانہ ہوائیں لہروں کو وجد آفریں گیت سناتی تھیں
اُبھر ابھر کے میں موجیں ساحل سے ٹکراتی تھیں
شمسہ تم نے کہا تھا مجھ سے "مانجھی کو طوفان سے کیا"
وُہ تو ہیبتناک بھنور کی چیخ سے تال ملاتا ہے

جب کشتی ڈگمگ کرتی تھی جذبات ہچکولے کھاتے تھے
طوفان بداماں گنگا میں تب آنسو دیپ جلاتے تھے
تارے ٹوٹ کے ساحل کا اک دُھندلا نقش دکھاتے تھے
شمسہ تم نے کہا تھا مجھ سے "مانجھی کو طوفان سے کیا"
وُہ تو ہیبت ناک بھنور میں اپنا جال بچھاتا ہے

کشتی ساحل چھوڑ کے جب منزل کی طرف بڑھ جاتی تھی
گنگا کے ہیجان میں تھوڑی اور بھی گرمی آتی تھی
ساحل کٹتے جاتے تھے اور وسعت بڑھتی جاتی تھی
شمسہ تم نے کہا تھا مجھ سے "مانجھی کو طوفان سے کیا"
وُہ تو ہیبت ناک بھنور کو اپنی چال چلاتا ہے

کروٹ موسم بدل رہا ہے باغوں میں ویرانوں میں
نُوری تو بھی اپنی کشتی چھوڑ دے اب طوفانوں میں
کوئی اب ترمیم نئی کر تپتے ہوئے ہیجانوں میں
شمسہ تم نے کہا تھا مجھ سے "مانجھی کو طوفان سے کیا"
وہ تو ہیبت ناک بھنور میں استقبال بناتا ہے

شذرات

فسادات کے اثرات

فسادات کی وجہ سے کاروبار کا ستیاناس ہوگیا ہے بعض دکانیں بند رہتی ہیں۔ باہر سے مال کی آمد و رفت کم ہو جاتی ہے۔ رسالہ کا کام معمولی سا ہے مگر فسادات کی وجہ سے ہمیں ایسی مشکلات پیش آئی ہیں کہ جو ہمارے تصور میں بھی نہ تھیں کئی پیسر بیکار بیٹھے ہیں۔ پریس کئی کئی دن بند رہا اور اب جو کھلا ہے تو پورا عملہ حاضر نہیں ہو رہا۔ کاتب صاحبان لاہور کی مسموم فضا سے متاثر ہو کر اپنے اپنے گاؤں کو چلے گئے۔ پرچہ لیٹ ہو گیا پھر اس میں کئی قسم کی کتابت کے نمونے کاغذ بھی پورا نہیں ملا۔ تاہم بھی جو کچھ انسانی کاوش سے ممکن ہو سکتا تھا وہ حاضر ہے آئندہ اس کو سدھارنا یا بگاڑنا حالات کے ماتحت ہے جو اتنی سرعت سے بدلتے اور ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا ناظرین سے گزارش ہے کہ وہ اس سے متاثر نہ ہوں۔ بلکہ ہماری نیک نیتی و ہمت پر بھروسہ رکھیں۔

عید نمبر کی تیاریاں

ادھر یہ مشکلات ہیں ادھر ہم نیرنگ خیال کے عید نمبر نکالنے کی فکر میں ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم اس سال عید نمبر کتابی صورت میں اڑھائی سو صفحہ حجم پر شائع کریں اور یہ تمام مکمل ایک ہی مضمون پر محیط ہو۔ وہ مضمون ہے "اسلامی دنیا" مراکش سے لیکر مصر تک اور مصر سے ترکی، عرب، عراق، ایران، افغانستان اور ہندوستان کے علاوہ ہمہ مسلمانان عالم کے متعلق تازہ ترین حالات و کوائف خوبصورتی سے جمع کر دئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب لکھنے اور شائع کرنے پر کثیر محنت و خرچ درکار ہے لیکن ہم اس کی تکمیل و اشاعت میں پوری پوری سعی کریں گے۔ جون نمبر آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جولائی میں کوئی پرچہ شائع نہ ہو گا۔ بلکہ جولائی اور اگست کا مشترکہ نمبر اسلامی دنیا کے عنوان سے ایک خوبصورت کتاب عید کے موقع پر آپ کی خدمت میں پیش ہوگی۔ بازار میں اس کی قیمت دو روپیہ ہوگی مگر مستقل خریداروں کو یہ نمبر اسی چندہ میں ملے گا ہم ۳ر کے ٹکٹ رجسٹری کے لئے آپ سے طلب کرتے ہیں۔ ورنہ یہ قیمتی کتاب دوبارہ کسی قیمت پر آپ کو نہ بھجوائی جا سکے گی۔

مکرر عرض ہے کہ جولائی میں کسی پرچے کا انتظار نہ فرمائیے گا۔ ہماری کوشش ہے کہ عید سے قبل یہ کتاب ہر جگہ پہنچ جائے۔ لیکن اگر خدانخواستہ دنیا کے حالات مزید بگڑ گئے۔ تو ناظرین ہماری مجبوری کے پیش نظر انتظار فرمانے پر مجبور ہونگے۔

عریاں افسانے

مسٹر اے۔ آر خالد لکھتے ہیں۔ ان افسانہ نگار حضرات کے نفسیاتی اور تہذیب سے گرے ہوئے افسانے پڑھ پڑھ کر جسم میں روح تلملا اٹھتی ہے۔ جو بیشتر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں وہ ۵۰ افسانے میرے مطالعہ میں آئے ہیں۔ جسے کسی شریف النفس انسان کی ذہنیت کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ ان اصحاب نے ادبیت اور تمدن کے صاف و شفاف چہرے کو پراگندہ بیانی سے نجس و ناپاک کر دیا ہے۔

میں حیران ہوں کہ رسالوں کے ادارے ان اصحاب کے افسانوں کو کیوں شائع کر دیتے۔ ادیب و شاعر عوام کے راہبر ہوتے ہیں۔ ان کو چاہیئے کہ عوام کی ذہنیتوں کو مہذب اور پر اخلاق بنائیں۔ نہیں چاہیئے کہ عوام کے رجحان کو بد اخلاقی بد اطواری سے بچا کر ان میں کردار پیدا کریں"۔ ہمیں توقع ہے۔ کہ ہمارے افسانہ نگار جناب خالد کی گزارشات پر ضرور غور فرمائیں گے۔ (ادارہ)

افسانہ

قتل کا مقصد

جس اخبار کو اُٹھائیے۔ اس میں قتل و غارت کی خبریں نمایاں عنوانات کے تحت شائع کی جاتی ہیں۔ لوگ ایسی خبروں میں دلچسپی بھی لیتے ہیں اور گھنٹوں قتل کے اسباب۔ قاتل کا مقصد اور اس قتل کے نتائج پر بحث کرتے رہتے ہیں۔ جب قاتلوں کو سزا کے پھانسی یا عبور دریائے شور کی سزا ملتی ہے تو اس واقعہ کی صدائے بازگشت گفتگو کا موضوع بنتی ہے۔

افسانے اور ناولوں میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتے ہیں۔ جن میں پُراسرار قتل کے واقعات زیادہ ہوں۔ ہر قصہ نگار اور ناول نویس ہمیشہ ایسے پلاٹ کی تلاش میں رہتا ہے۔ جس میں کسی پُراسرار قتل اور ہیبت ناک قاتل کے لرزہ خیز حالات ہوں۔

لیکن مجھے ان امور سے چنداں دلچسپی نہیں۔ میرا دوست رفیق احمد مراد آباد کا مشہور سراغرساں ہے اُسے سی۔ آئی۔ ڈی میں کام کرتے بیس سال ہو چکے ہیں اور دن رات اُسے ایسے واقعات سے سابقہ پڑتا ہے۔ جن میں قتل اور قاتلوں کا مضمون بار بار دہرایا جاتا ہے۔ رفیق احمد کا بیان ہے کہ قاتلوں کو گرفتار کرنے کے لئے موقع قتل پر چھوڑے ہوئے نشانات اتنی راہنمائی نہیں کرتے جتنا قتل کا مقصد معلوم کر لینے سے گرفتاری میں آسانی ہوتی ہے۔ رفیق احمد کا کہنا ہے نعش کے اردگرد آلۂ قتل۔ کوئی کپڑا۔ پاؤں اور اُنگلیوں کے نقوش۔ لباس کا کوئی حصہ یا دیگر نشانات محض ثبوتِ جرم میں امداد تو بہم پہنچاتے ہیں۔ لیکن قاتل کے گرفتار کرنے میں اتنے ممد و معاون ثابت نہیں ہوتے۔ جتنا اس نظریہ کا معلوم کر لینا کہ قتل کا مقصد کیا تھا۔ اگر یہ بات معلوم ہو جائے تو قاتل کے گرفتار کرنے کی کلید ہاتھ آ جاتی ہے۔

مَیں نے کہا اگر کوئی مقصد ہی نہ ہو۔ تو!

اس پر رفیق احمد قہقہہ لگا کر ہنسا اُس نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے ہر قتل کے مختلف مقاصد ہوتے ہیں۔ دشمنی۔ حسد۔ انتقام۔ وراثت۔ ذاتی حفاظت۔ لُوٹ اور محبت پھر ان کے ذیلی عنوانات بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً ذاتی حفاظت میں ایک نقب زن مالک مکان کو قتل کر دیتا ہے۔ یا ایک بلیک میلر کا منہ بند کرنے کے لئے اُس کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ہر حالت میں قتل کا ایک مدعا یا مقصد ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے سراغرسانی میں مجھے سب سے زیادہ مقدم چیز ہر قتل کا مدعا معلوم کرنا ہوتا ہے۔

میرا نظریہ رفیق احمد سے قطعاً مختلف تھا کسی کا قتل کر دینا بالکل ایک معمولی بات ہے۔ صرف اس قتل کو چھپانا اور گرفتاری کا خوف ہی اُسے دہشتناک بنا دیتا ہے۔ لوگ روزانہ قتل سے اہم افعال کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں اس لئے میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ رفیق احمد کے نظریہ کو غلط ثابت کر کے دکھاؤں گا۔ میرا نظریہ یہ تھا کہ قتل کا مقصد کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ یونہی سرزد ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ایک رات جبکہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے تاریکی چاروں طرف مسلط تھی۔ مَیں ایک گلی میں نکڑ کے قریب ٹھہر گیا۔ ایک آدمی میرے پاس سے گزرا جس کے سر پر مَیں نے لوہے کی ایک سلاخ سے وار کیا۔ اس کی کھوپڑی ایک ہی وار سے ٹوٹ گئی۔ وہ تیورا کر گرا۔ مَیں نے نعش کو وہیں پڑا رہنے دیا۔ اور کامل سکون سے گھر واپس لوٹ آیا۔

میں اُس آدمی کو نہیں جانتا تھا۔ نہ میں نے اُس کا چہرہ دیکھا۔ نہ اُسے چھُوا۔ نہ میں نے وہاں کوئی نشان چھوڑا۔ نہ مجھے کسی نے دیکھا۔ یہ قتل سراسر بے مقصد اور بے معنی تھا۔ سولئے اس خواہش کے کہ میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا، کہ قتل بے مقصد ہوتے ہیں۔ گو خود یہ اپنی جگہ بھی ایک مقصد تھا۔ مگر اس کا کسی کو شبہ تک نہ ہو سکتا تھا۔

میں نے سلاخ کو اپنے مکان کے صحن میں دفن کر دیا۔

دوسرے دن میں نے اخبارات میں اس آدمی کی نعش کے پائے جانے کا تذکرہ پڑھا۔ اس کا نام اکرم تھا۔ یہ جنرل مرچنٹ کی دکان کرتا تھا۔ خوش پوش، کھاتا پیتا آدمی تھا۔ اس کی کسی سے دشمنی نہ تھی۔ نہ اس نے کوئی قرضہ دینا تھا۔ نہ وہ محبت کے کوچہ کا شیدائی تھا۔ اس کی جیب کی نقدی کو چھُوا تک نہ گیا تھا۔ اور بظاہر اس کے قتل کا کوئی مقصد معلوم نہ ہوتا تھا۔ میں زیر لب مسکرایا۔ کیونکہ اب میرا نظریہ رفیق احمد کے نظریہ پر فتح پاتا معلوم ہوتا تھا۔

کچھ دن گزر گئے اور میں اپنے نظریہ کی کامیابی پر خوش و مطمئن تھا۔ کہ مجھے بمبئی ایک فلمی ادارہ میں کچھ کام مل جانے کی وجہ سے جانا پڑا۔ چنانچہ یہ واقعہ اب میرے ذہن سے اُتر چکا تھا

چھ ماہ کے بعد میں مراد آباد واپس آیا۔ دوسرے دن سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر رفیق احمد میری ملاقات کے لئے آیا۔ میں نے اُس کے لئے چائے منگوائی۔ بمبئی اور میرے سفر کی کامیابی پر چند باتیں ہو چکنے کے بعد اُس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

آپ تو بمبئی چلے گئے تھے۔ لیکن ہم نے آپ کے نظریہ کو غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ ہم نے اکرم کے قاتل کو گرفتار کر لیا اور اُسے پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا۔

میں حیرت سے اُچھل پڑا۔ میرے چہرہ کا رنگ سفید پڑ گیا۔ مگر رفیق احمد نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی پھانسی پر لٹکا دیا گیا! میں نے تعجب سے سوال کو دہرایا۔ کون اور کیوں پھانسی دے دیا گیا؟ مجھے مکمل روئداد سنایئے! میری بیچینی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

رفیق احمد نے چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا، گھبرایئے نہیں۔ سب کچھ سُناتا ہوں۔ واقعۂ قتل کا تو آپ کو علم ہی ہے۔ تین ہفتے کی مسلسل دوڑ دھوپ کے بعد میں اس قتل کا مقصد جان گیا۔ اس قتل کا مقصد تھا جذبۂ انتقام۔ ایک اور دکاندار علی بخش جنرل مرچنٹ کی دوکان اکرم کی دوکان کے سامنے تھی۔ لیکن اکرم کی دوکان آہستہ آہستہ ترقی اور علی بخش کی دوکان تنزل اختیار کرتی گئی۔ غریب علی بخش چند سالوں میں بالکل برباد ہو گیا۔ قاتل نے کئی دفعہ لوگوں سے کہا کہ اگر اس کا بس چلے تو وہ اکرم کو قتل کر ڈالے۔ اکرم کی ارزاں فروشی اُسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ اس کی دکان پر پکٹنگ کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کئی آدمیوں نے شہادت دی کہ انہوں نے اسے اکرم کے مکان کے گرد کئی بار منڈلاتے دیکھا ہے۔ ہم نے اس کے مکان سے ایک لوہے کی سلاخ بھی برآمد کی جو مقتول کے نشانِ زخم پر ٹھیک بیٹھتی تھی۔ علی بخش کے مکان سے بہت سا تحریری مواد بھی ملا۔ جس میں وہ علی بخش کے خلاف مضامین لکھ کر پراپیگنڈا کرنا چاہتا تھا۔ الغرض قاتل کے خلاف متعدد ثبوت اور شہادتیں جمع ہو گئیں۔

میں نے جلدی سے پوچھا اور ملزم آخر دم تک انکار کرتا رہا؟ بے شک۔ رفیق احمد انسپکٹر نے کہا۔ بہت سے قاتل آخر تک انکار ہی کرتے رہتے ہیں۔ جیوری نے اُسے مجرم قرار دے دیا اور پھانسی کی سزا کی سفارش کی اور وہ پھانسی پر لٹکا دیا گیا

لیکن یہ بہت بُرا ہوا۔ وہ بے گناہ تھا۔ میں نے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر نے کہا مذاق کو چھوڑو اور عقل کی بات کرو۔

میں نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے ہی اُسے قتل کیا تھا اور تمام واقعہ اُسے الف سے ی تک کہہ سنایا۔

انسپکٹر نے جلدی سے اُٹھتے ہوئے کہا کہ تم اپنے نظریہ کو درست ثابت کرنے کے لئے انسپکٹر نے جلدی سے اُٹھتے ہوئے کہا کہ تم اپنا نظریہ درست ثابت کرنے کے لئے مجھے پاگل بنا دینا چاہتے ہو یا تمہارا دماغ خراب ہے۔ جس قتل کے متعلق مجرم سزا پا چکا ہو میں اُس کے متعلق کوئی مزید بات سُننا پسند نہیں کرتا۔

وہ اُٹھ کر غصّے سے باہر چلا گیا اور پھر کبھی مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ یا تو اُسے میری بات پہ یقین نہیں آیا۔ یا وہ اب قاتل کو گرفتار کرنے سے گریز کرتا ہے۔

(۲)

یہ تو تھا میرا قصہ لیکن ایک انگریزی میگزین میں بزد آمد میں نے پڑھا ہے۔ وہ میرے بیان کردہ افسانہ سے زیادہ دلچسپ ہے۔ ایک شخص ایڈورڈ نامی لکھتا ہے:۔

"میں یہ خط یا مضمون جیل میں لکھ رہا ہوں، پھانسی کی کوٹھڑی سے، جہاں میں پھانسی لٹکائے جانے کا منتظر ہوں۔ کیا آپ سُن رہے ہیں؟ پھانسی پہ لٹکے کیلئے۔ اُس جرم کے لئے جو مجھ سے سرزد نہیں ہوا۔ میں مار دیا جاؤں گا! قتل کر دیا جاؤں گا!! صرف اس لئے کہ میں نے افسانوں کی فروخت کے لئے ایک چال چلی تھی۔ جس کے پُر پیچ پھندہ میں خود ہی پھنس کر رہ گیا ہوں۔

یہ چال ایک انوکھی سکیم تھی۔ متانت اور قابلیت سے تیار کی ہوئی۔ جس کی طفیل اب میری گردن توڑی جائے گی۔ کیونکہ میں کامل ہوشیاری سے اس کی تمام تاریں جوڑ نہیں سکا۔

آپ یقین کیجئے کہ میں قاتل نہیں بے گناہ اور معصوم ہوں۔ قتل کا کوئی واقعہ میرے سے بڑا ہی نہیں۔ یہ سب ایک حادثاتی معاملہ تھا۔ جس میں اتفاقاً میں ایک لاش سے دوچار ہوا جس کو میں نے عمر بھر کبھی دیکھا بھی نہ تھا، اور اب وہ کہتے ہیں کہ میں نے اُسے مار ڈالا ہے۔ اور میری کہانی پر یقین کرنے کو تیار ہی نہیں۔ کیونکہ اپنی بریت میں جو ثبوت میں دینا چاہتا تھا، وہ میں پیش نہیں کر سکا۔

میں نے اپنی آپ بیتی عدالت میں کہہ سُنائی، جس پر کسی نے اعتبار نہیں کیا۔ میں اسے اب قلمبند کر رہا ہوں اور مجھے اُمید نہیں ہے کہ آپ بھی اس پر یقین کریں۔ کیونکہ تم تمام اندھے۔ بیوقوف اور جاہل مُطلق ہو۔

تُم سب احمق ہو۔ قاتل ہو!!

میں پیشہ کے لحاظ سے ایک دندان ساز ڈاکٹر تھا۔ اِس کے علاوہ میں مختصر کہانیاں اور افسانے اور ناول لکھا کرتا تھا۔ میرا انتہائی خیال یہ تھا۔ کہ ایک نہ ایک دن میں دُنیائے ادب پر چھا جاؤں گا۔ میرے افسانوں اور ناولوں کی مانگ ہوگی۔ کیونکہ میرے افسانے واقعی قابلِ اشاعت اور قابلِ قدر ہیں۔ لیکن اس ادبی حصار کو پھاند لینا کٹھن کام ہے۔ جو نامور لکھنے والوں نے بہر نو آموز کے راستہ میں کھینچ رکھا ہے۔ میں نے ایک انوکھی تجویز سوچی۔ میرے مسلسل افسانے ادبی اداروں اور ایڈیٹروں کے ہاں سے بغیر پڑھے ہوئے واپس آ جاتے تھے۔

چنانچہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ شہرت۔ قبولیت اور دولت کے حصول کے لئے مجھے پہلے اپنے آپ کو پوری اہمیت دلانے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کوئی غیر معمولی حرکت کریں۔ تو دُنیا فوراً آپ کی طرف رجوع ہوگی اور ہر اخبار نویس ایک گراں قدر چیک تمہارے سامنے پھینک دے گا۔ کہ آپ سب سے پہلے اُسے اپنی سوانح حیات نوٹ کرا دیں۔ آہ! اس فلک کے طور طریقے کیسے نرالے ہیں۔

میں نہ تو اتنا تیراک ہوں کہ کسی مقابلہ میں ریکارڈ توڑ ڈالوں نہ ہوائی جہاز یا موٹر اس تیز رفتاری سے لیجا سکتا ہوں کہ اخباروں کی نظریں مجھ پہ پڑیں۔ ڈربی کا اوّل انعام نکل آنے پہ بھی میری طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔ مگر میری قسمت کہاں کہ میں اس انعام کا مستحق قرار دیا جاتا۔ ان حالات میں اپنے آپ کو ایک قتل کے مقدمہ میں ملوث کرنا قرین دانش سمجھا۔ تاکہ اخباروں کی سُرخیاں میری تصویروں سے مزین ہوں اور پھر میرے رہا ہو جانے پر میرے افسانے اور

ناول فوراً معقول قیمت پر فروخت ہو کر پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں۔ ایسا موقع حاصل کرنے میں مجھے تین سال انتظار کرنا پڑا تھا۔ یقیناً میں بے وقوف تھا۔ بے وقوف۔ بے وقوف۔ جو کچھ مجھے یا کہیں سراسر درست ہے۔ میری داستان سنیئے۔

سات سال سے سسکس میں سمندر کے کنارے میں نے ایک چھوٹی سی جگہ کرایہ پر لے رکھی تھی۔ ایک کمرہ صحن اور باغیچہ کل اتنی جگہ تھی۔ میں ہر ہفتہ اپنے موٹر سائیکل پر وہاں جاتا۔ اور اتوار کا سارا دن تنہائی میں بسر کرتا۔ اپنے ناول اور افسانے پڑھتا۔ موسم گرما میں پورے دو ہفتے یہاں بسر کرتا۔ میں اپنے کسی دوست کو کبھی یہاں نہیں لایا تھا۔ کیونکہ زیادہ لکھنے پڑھنے کا مشغلہ نہیں ہوتا تھا

دو ہفتے کی بات ہے کہ میں نے اتوار کی صبح کو سمندر کے کنارے ایک لاش دیکھی۔ جسے سمندر کی لہروں نے اٹھا کر ساحل پر پھینک دیا تھا۔ یہ لاش بالکل برہنہ تھی۔ اس کے نقش و نگار اس طرح خراب ہو چکے تھے کہ اُسے شناخت کرنا ناممکن ہے۔ ایک عورت کی نعش تھی اُس کے اعضا کی مضبوطی سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ نعش کم از کم تین دن کی معلوم ہوتی تھی۔ اس پر کوئی شناختی نشان نہ تھا۔ میرا فرض تھا کہ میں پولیس کو اطلاع دیتا۔ لیکن فوراً مجھے خیال آیا کہ قدرت نے مجھے وہ موقع بہم پہنچا دیا ہے۔ جس کے لئے میں اتنی دیر سے زحمت کش انتظار تھا۔ کیوں نہ میں ایک قتل کے مقدمہ میں اپنے آپ کو ماخوذ کرا دوں۔ عدالت میں گھما گھمی ہو۔ اخباروں کے رپورٹر میری تصاویر شائع کریں۔ اور جب میں بری ہو جاؤں تو اس وقت جب میرا نام ہر شخص کی زبان پر ہوگا۔ اپنے مسودات کی منہ مانگی قیمت حاصل کروں گا۔

اس خیال کے آتے ہی میں فوراً اپنے کمرہ پر پہنچا۔ وہاں سے ایک کمبل اور کیمرہ لیا۔ کیمرہ میرا پرانا رفیق اور تصاویر اتارنے میں خوب تھا۔ سمندر کا یہ کنارہ قطعاً غیر آباد تھا اور میلوں تک کسی متنفس کی شکل دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس لئے میں نے نہایت اطمینان سے لاش کی تین تصویریں مختلف زاویوں سے لیں۔ پھر لاش کو کمبل میں لپیٹ کر اُسے اپنے باغیچہ میں لے آیا۔ باغیچہ میں اُسے سبز گھاس پر لٹا کر اس کے گرد ایک روزانہ اخبار رکھ کر اس طرح تصویر لی کہ اخبار کی تاریخ اور لاش دونوں تصویر پر آ جائیں۔ پھر باغ کے صحن میں میں نے ایک قبر کھود دی اور لاش کو کمبل میں لپیٹ کر قبر میں رکھا۔ قبر میں اپنا سگرٹ کیس جس پر میرے نام کے حروف کندہ تھے گرا دیا۔ اور قبر میں رکھنے کے بعد پھر اس کی تصویر لی۔ اس کے بعد قبر کا منہ بند کر کے نعش کو دفن کر دیا۔

اب میں اپنے کام سے بخوبی فارغ ہو گیا تھا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ سوائے اس کے کہ میں نے ایک نعش کو پولیس کی اطلاع کے بغیر دفن کر دیا تھا۔ اب میں نے اطمینان سے گرم پانی کا غسل لیا۔ جس میں پٹاسیم پرمنگیٹ کی کافی مقدار شامل کی تھی۔ تاکہ ہر قسم کے جراثیم سے میرا جسم پاک ہو جائے۔ میں نے کپڑے تبدیل کئے۔ آج کے تمام واقعہ کو قلمبند کیا۔ اس پر مہر ثبت کی۔ یہ یادداشت اور کیمرہ جس میں تمام تصاویر کے عکس تھے ایک اٹاچی کیس میں بند کر کے اپنے پلنگ کے نیچے رکھ دئے۔ ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر میں نے ایک گمنام خط کا مضمون بڑی چالاکی سے تیار کیا۔ جس میں پولیس کو ایک عورت کے قتل اور اس جگہ کے نام و پتہ سے اطلاع دی گئی تھی۔ اس خط کو پوسٹ کر کے اب میں پولیس کے انتظار میں ہو بیٹھا تاکہ وہ آ کر مجھے گرفتار کرے۔ میری [illegible] کا پروگرام کامیاب ہو اور میں رہا ہو کر اپنے مقصد کو حاصل کروں۔

بے وقوفو! احمقوں کی دنیا میں بسنے والو! تم نے اخبارات میں میری تصویر۔ قتل کے حالات اور الزامات وغیرہ سب کچھ مطالعہ کیا ہوگا۔ لیکن یقین کرو کہ تم ایک بیگناہ کو پھانسی دے رہے ہو۔

پولیس آئی۔ اس نے مجھ سے پوچھ گچھ کی میں نے جان بوجھ کر الٹے سلٹے جواب دئے۔ انہوں نے زمین کھود کر لاش نکال لی۔ کمبل اور میرا سگرٹ کیس بھی۔ وہ اس لاش کو شناخت نہ کر سکے۔ مگر مجھ پر مقدمہ چلانے میں ان کے پاس کافی سے زیادہ ثبوت تھے۔

خودی اور بیخودی

از
جناب میر محمود علی بادشاہ
ایم۔اے میسور

مَیں خودی و بیخودی کو نہ فلسفیانہ نکتۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتا ہوں نہ شاعرانہ۔ میرا مدعا ان دو لفظوں سے کچھ اور ہے۔ عام طور پر خودی کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ خودی درست ہوش و ہواس کو کہتے ہیں۔ چنانچہ معمولی گفتگو میں پوچھا جاتا ہے "کیا تم اپنی خودی میں ہو"؟ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ تمہارے ہوش و حواس ٹھیک ہیں یا نہیں؟ جواب مثبت ہو۔ تو اس حالت کو خودی کہینگے اور منفی تو اُسے بیخودی کہا جائے گا۔

۲۔ خودی و بیخودی کے معنے متعدد کیوں نہ ہوں مگر اتنی بات ضرور ہے کہ ان دو لفظوں کا اطلاق صرف انسان کی ذات پر ہوتا ہے۔ جس انسان میں محاسن و کمالات جتنے زیادہ ہوں گے اسی قدر وہ اپنی خودی کو پہچاننے والا کہلائے گا۔ علم اور اُس کے ذریعہ سے باطنی کمالات کا اکتساب کسی انسان کے مدارج کو یقیناً ارفع کرتا ہے اسی کو مدِ نظر رکھ کر اقبال نے کہا ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خُدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ایسی خودی کا حامل ہی وہ فرد ہے جس کی تخلیق پہ قدرت کو ناز ہے۔ یُوں تو انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ مگر کیا ہر فردِ بشر اس عظیم الشان خطاب کا مستحق ہو سکتا ہے؟ کیا ایک مردِ خسیس کو کسی معصوم ہستی کے ساتھ اشرف مخلوق کے خطاب کی ترازو میں تولا جا سکتا ہے؟

۳۔ خُودی کا یہ مصداق یعنی انسان نہیں معلوم قدرت کو کیوں اتنا محبوب ہوا کہ تمام اعزازی خطابات کا مستحق وہی سمجھا گیا اور جملہ انعامات و اکرامات بھی اسی کے لئے مخصوص ہو گئے۔ اس ہستی کو محض اشرف مخلوقات کا خطاب دے کر قدرت خاموش رہتی تو جائے اعتراض نہ تھی سخن گسترانہ بات تو جب آپڑی کہ اس مٹی کے پُتلے کے آگے جبہ سائی کرنے کے لئے نہ صرف نوریوں کو حکم صادر ہوا بلکہ ان کے ناری معلم کو بھی یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ فرمانبردار شاگردوں کے سامنے ان اُن کا ناری اُستاد اپنی عزت و وقار کو جانے دے اور ایک کمتر ذات کے روبرو عجز و انکسار کے طریقے سے اپنا سرِ افتخار جھکا دے پس اُسے حاکمِ اعلیٰ کا موردِ عتاب بننا گوارا ہوا اور مٹی کی حسین اور قابلِ رشک صورت کی برتری کو قبول کرنا پسند نہ آیا نہیں معلوم خاک کی اس دلآویز شکل میں حسن و کمال کیونکر سما گیا کہ جس کی بنا پر ؎

نازسے خامۂ قدرت نے کہا واہ رے میں
اور تصویر یہ بول اُٹھی کہ اللہ رے مَیں

۴۔ رہی یہ بات کہ قدرت نے خودی کے اس حامل کو کیوں پیدا کیا۔ کیا صرف اس لئے کہ اس سراپا ناز کے آگے یہ مخلوق مجسمۂ نیاز بن جائے؟ کیا اس واسطے کہ نوری خلقت کی طرح صبح و شام تسبیح و تہلیل میں اوقات بسری کرے؟ اگر قدرت کا مقصد یہ ہوتا تو اس مخلوق کی خمیر مٹی سے نہ ہوتی اس مخلوق کو بھی نوری بنا دیا جاتا تو وہ بے چون و چرا مصروفِ پرستش ہو جاتی۔ مٹی سے بنا کر شرف بخشنے کا سبب ہی تھا کہ نوریوں میں تابِ ضبط نہ رہی اور وہ بیخود ہو کر قدرت سے شکایت کرنے لگے کہ تیری خلافت و نیابت کے لئے کیا وہ ذات مناسب ہو سکتی ہے۔ جو فتنہ و فساد برپا کرے گی اور خون بہانا جس کا شعار ہوگا۔ اس اعتراض میں نوریوں کو درحقیقت فطرت کی اس حسین مخلوق کے ساتھ حسد تھا کہ یہ کایا پلٹ کیسی

کیسی ہے۔ نار یا نور جس میں فراز کرنے کی صفت ہے سعادت قرار دیا جائے۔ اور خاک جس میں نشیب کی جانب مائل ہونے کی خو ہے وہ بلند منزلت ہو۔

۵۔ اب ہمیں یہ دریافت کرنا پڑے گا کہ خودی کے اس حامل میں کیا ایسا حُسن ہے۔ جس کی بنا پر وُہ خود قدرت کے لئے مایۂ ناز بن جائے۔ غور و خوض سے ہمیں معلوم ہو گا۔ کہ کائنات کا یہ نائب نہ صرف ظاہری حُسن کی وجہ سے دوسروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ بلکہ اُس کے باطنی کمالات بھی بے پناہ ہیں۔ اور تمام مخلوقات میں اسے بے نظیر و یکتا بنا رہے ہیں پہلے ہم ظاہری حُسن کی ایک جھلک دیکھیں گے۔ کائنات کی مختلف اشیاء میں صرف ایک وصف پایا جاتا ہے مجموعی طور پر وہ اوصاف کسی ایک شئے میں نظر نہیں آتے۔ سنبل کے تاروں میں کسی قدر درازی و پیچیدگی، سرو میں بلندی، مُشک میں خوشبو، گلاب میں نزاکت و لطافت۔ موتی میں سفیدی و چمک۔ لعل و یاقوت میں سرخی۔ ہلال میں دلآویز کجی۔ بلبل کی آواز میں سُریلا پن۔ طاؤس میں خرام کی صفت۔ شیر میں ہیبت۔ آہو کی چشم میں جاذبیت۔ یہ تمام انفرادی چیزوں کی انفرادی خصوصیات ہیں۔ قُدرت کی بارگاہ میں حُسن کی تقسیم ہوئی تو ایک ایک چیز کو تھوڑا تھوڑا حصّہ ملا۔ پھر تمام چیزوں کی خصوصیات کو جمع کر کے فطرت کی اس شاہکار ہستی کے سپرد کر دیا گیا۔ جبھی تو انسان کے لئے غیرتِ حُور۔ پری جمال۔ رشکِ قمر۔ مہر طلعت۔ آہو چشم۔ گل چہرہ۔ سرو قد۔ سمن بر۔ برق ادا۔ بُلبل نوا وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ جن سے فطرت کی مختلف چیزوں کی ایک ایک خوبی کا پہلو انسان کے شاندار مرقع میں اپنی جھلک دکھانے لگتا ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ انسان کے حُسن کی تعریف بجا طور پر ہو نہیں سکتی تھی۔ تو کائنات کی مختلف چیزوں سے مشابہ کرنے کا رواج پڑ گیا۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کو مشابہت دی جاتی ہے وہ افضل ہوا کرتی ہے۔ اور جس سے مشابہ کیا جاتا ہے وہ کم ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ اس افضل و برتر ہستی کی کوئی چیز رد کش ہو سے

اُٹھا کے آئینہ دکھلا دیا اُسے میں نے
نہ سوجھی عارضِ گلگوں کی جب مثال مجھے

اس کے بعد ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ باطنی کمالات کا رنگ پیکرِ خودی کی تخلیق ہوئی۔ اگر یہ ہستی نہ پیدا کی جاتی تو صرف ہُو کا عالم رہتا۔ یہ چہل پہل اور رونق جس نے دنیا کو دُنیا بنایا کہاں ہوتی۔ کائنات کے اسرار پر سے پردے اُٹھا کر سمجھانے کا سلیقہ کس میں تھا؟ افلاک اور ان کے حقائق سے واقفیت بہم پہنچانے کا مجاز کون ہو سکتا تھا۔ زمین کے پوشیدہ خزانوں کو دریافت کرنے کی اہلیت کس میں تھی؟ بحر کی تہ تک پہنچنا اور اس کا حال معلوم کرنا کس کے بس کی بات تھی؟ شعاعوں اور ہواؤں کے اثرات اور قوتوں کو پہچاننے کی قوت کس میں تھی۔ غرض فطرت کے کارخانے میں تصرفات اس ہستی کے سوا کسی اور سے ممکن تھے؟

۷۔ اس میں کیا شک ہے کہ قُدرت نے ساری کائنات کو اسی خودی کے حامل کے لئے پیدا کیا ہے۔ قُدرت کا منشا یہ ہے کہ خُودی کا یہ حامل اس وسیع کائنات میں اپنی زندگی نہایت پُرلطف طریقہ سے گزارے اس کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے کائنات کی ہر ایک چیز اس کے تابع فرمان کر دی گئی۔ بشرطیکہ اس میں فرمانروائی کا سلیقہ ہو۔ شیر۔ ہاتھی اور اُونٹ جیسے پُرہیبت اور تہمتن جانور اُس کے حلقۂ اطاعت میں آ جاتے ہیں۔ شیریں میوے اس کی زبان کی لذت کے لئے فراہم ہیں۔ صاف و شفاف چشمے اُس کی پیاس بجھانے کی خاطر لہریں مارتے رہتے ہیں۔ ہیرے جواہرات اُس کی آرائش کے لئے۔ غرض اُس کی ضرورتوں کا تمام سامان اس کائنات میں موجود ہے۔ بشرطیکہ خودی کا یہ حامل حالتِ خودی میں اُن چیزوں سے جائز فائدہ اُٹھائے۔ اگر وہ خودی کے بجائے بیخودی کے عالم میں ناجائز طریقہ سے فطرت کی اشیاء پر دستِ تصرف دراز کرے گا تو خود

یہ کیا اعتراض ہے۔ درحقیقت یہی چیز وجہِ تخلیق ہے اس طرح پیکرِ خودی کی تخلیق ہوئی۔

فطرت ہی اسے شدید ترین سزا دے کر اس سے تمام خوبیاں چھین لیتی ہے۔

بیخودی کے معنے ہم خودی کو کھو لینے کے لیں گے۔ خودی کا تعین ہم نے علم اور باطنی کمالات کے ذریعے سے نیکیوں کی طرف مائل ہونے پر کیا ہے۔ تو بیخودی سے ہمارا مطلب علم و کمال کا غلط استعمال اور صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتا ہے۔ خودی و بیخودی کے معنی اس طرح معین کرنے کے بعد ہم دنیا کے ماضی و حال کا مجمل طور پر جائزہ لیں گے۔

۹۔ دنیا کی تاریخ اُن افراد کے اسمائے گرامی کو جو خودی کا شعور رکھتے ہوئے بلند مدارج پر فائز ہوئے شہرتِ عام اور بقائے دوام دے چکی ہے۔ حاتم کی سخاوت، مجنوں و فرہاد کے عشق کا خلوص، نوشیرواں کا عدل، سقراط کی حکمت، سکندر کی عظمت، ہادیانِ برحق کی عصمت و ہدایت اور مظلومی کو کوئی کیونکر بھول سکتا ہے؟ البتہ فرعون، شداد، نمرود، ہامان، نیرو، قارون وغیرہ کے نام بھی جن پر بیخودی طاری تھی کسی کے ذہن سے محو نہیں ہو سکتے۔ مگر ان کے نام ہمیں یاد ہیں، تو عبرت و ملامت کے لئے اور ان کے تعریف و توصیف کی خاطر تاکہ ہم تقلید کر سکیں۔

۱۰۔ موجودہ دنیا علوم و فنون کی رو سے البتہ بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ لیکن یہ ترقی معکوس ہے۔ سائنس کے انکشافات حیرت انگیز ہیں۔ مگر تباہ کن تہذیب و شائستگی کے دعوے تو ہیں مگر اخلاقِ حسنہ کا پتہ نہیں۔ اقوام میں اتحاد نہیں۔ ایک مُلک کے باشندوں میں اتفاق نہیں طوائف الملوکی فرقہ بندی۔ آزادی کے ادعا کا بول بالا ہے۔ قدرت نے انسان کو اپنا نائب بنا کر وسیع سرزمین سپرد کی ہے۔ تو اس کے ابنائے جنس اپنے اعمال و افعال سے اس منزل کو اپنے لئے خود تنگ کر رہے ہیں ؎

شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت

گویا آج کل ہر کس خودی کے بجائے بیخودی کے عالم میں مبتلا ہے۔

۱۱۔ خودی کو کھونے اور بیخودی میں مبتلا ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ سچی خوشی اور اطمینانِ قلب کسی کو میسر نہیں۔ وہ بیدا ادبی کی کمی کئی پشتوں سے ہمیں محسوس نہ ہوئی تھی اور زندگی کی وہ ضروریات جو قدرت ہمیں آسانی اور بافراوانی سے بہم پہنچایا کرتی تھی۔ آج اُن کی دستیابی بھی ہمارے لئے مشکل بن گئی ہے۔ سائنس کے ایجاد کردہ آلات قوموں اور ملکوں کے وجود کو معرضِ خطر میں لا چکے ہیں۔ موجودہ انسان بندۂ خدا نہیں بلکہ بندۂ نفس بنا ہوا ہے۔ وہ اپنی خوشی کی خاطر دوسرے کو ضرر پہنچانے میں کبھی تامل نہیں کرتا۔ دنیا کا یہی رنگ رہا تو اہلِ دنیا کی تباہی و بربادی یقینی ہے۔ اہلِ دنیا کے اطوار بدلیں۔ خود اعتمادی اور دوسروں پر بھروسہ کرنے کی خو اُن میں پیدا ہو۔ اور عاجز مخلوق ہونے کا احساس ان کے دل میں گھر کرے تو کیا عجب ہے رحمتِ الٰہی پھر جوش میں آئے اور یہ دنیا ہمارے لئے بہشت کا نمونہ بن جائے شرط یہ ہے کہ انسان خود غرضی کو ترک کرے اور دوسروں کی فلاح و بہبود کا خیال رکھے۔

غزل

پریشانی و مجبوری محبت کا تقاضا ہے
مرے دل کو ابھی تک اُن سے ملنے کی تمنا ہے
نفس کی آمد و شد سے پتہ چلتا ہے منزل کا
ہے اس کی تہ میں پنہاں رمزِ ہستی کی وہ گہرائی
ہیں اس کو دیکھتا بھی حیرتِ جلوہ میں گم ہو کر
ابھی تک اک چراغِ اُمید کا جلتا ہے مدھم سا

زباں خاموش ہے پلکوں پہ اک آنسو لرزتا ہے
مجھے گو پاس ہے بے اس اک منت رکتا ہے
تھکا ہارا مسافر راہِ ہستی سے گزرتا ہے
مری چشمِ حقیقت میں سمندر ایک قطرا ہے
نگاہِ عشق پر اپنی یہ مجبوری کا پردا ہے
فلک پر آخری تارا ابھی تک جھلملاتا ہے

پرواز جعفری

علامہ شفیق جون پوری

از حضرت خیال لکھنوی

کئی سال کا عرصہ ہوا کہ بنارس کے ایک معیاری مشاعرے میں حقیر بھی برائے بیت کی حیثیت سے شریک ہوا۔ مشاعرہ طرحی تھا اور نہایت نظم ونسق کے ساتھ داد وتحسین کا مرکز بنا ہوا تھا۔ کہ عین شباب کے عالم میں صدر محترم نے ایک شاعر کے نام کا اعلان کیا۔ مگر یہ اعلان صدا بصحرا ثابت ہوا۔ لہٰذا اس نام کی تکرار ہوئی۔ جس کے جواب میں ایک شخص نحیف و کمزور درخ خبر و جیہہ چالیس سالہ صفِ شعرا سے اُٹھ کر دوسروں کے کندھوں کا سہارا لیتے ہوئے صدر کے پہلو بہ پہلو جا کر بیٹھ گیا۔ سامعین نے اپنی اپنی قیافہ شناسی سے کام لیتے ہوئے فوراً نتیجہ نکال لیا۔ یہ شاعر محفل کو خراب کر دے گا اور اس کے ماتحت وہ چہ میگوئیوں میں مصروف ہو گئے۔ مگر شاعر تجربہ کار تھا لہٰذا محفل سے مرعوب نہ ہوا۔ اور سامعین کی حرکات کو بیہودگی پر محمول کرتا ہوا بولا "تمیز سے سُنیئے معیاری شاعر ہوں"۔ محفل خاموش ہو گئی اور سامعین کی عموماً اور سامعین کی عموماً اور شعرائے اکرام کی خصوصاً نظریں شاعر پر ثبت ہو گئیں۔ شاعر نے طرح میں کچھ پیش کرنے سے قبل ایک قطعہ "احساس خودی" کے عنوان سے پڑھا۔ قطعہ پڑھا کہ محفل میں آگ لگا دی۔ ایک غیر ارادی شور اُٹھا اور قناتوں سے ٹکرا کر پنڈال میں گونج گیا "پھر فرمائیے"۔ "مکرر عنایت ہو"۔ "بس پڑھے جائیے"۔ "سیری نہیں ہوتی" یہ فقرے تھے۔ جو مستقل طور پر فضا میں رقصاں تھے۔ سات آٹھ۔ آخر کتنی مرتبہ پڑھتا۔ مجبوراً شاعر نے قطعہ نظر انداز کرتے ہوئے غزل چھیڑی۔ غزل چھیڑی کہ دیگر شعرا کے تار امید کے تار ٹوٹ گئے۔ اور مایوس ہو گئے۔ کہ اب ان کی غزل کسی داد کی مستحق نہیں رہی۔ داد وتحسین کے تمام الفاظ، تمام تراکیب اور تمام اصطلاحات اسی شاعر کی غزل پر صرف ہو گئیں۔ یعنی کہ غزل کی نزاکت پر تعریف کا یہ انبار بار ہونے لگا۔ پھر بھی سامعین کی تشنگی نہ جاتی تھی اور تکرار الفاظ کی برابر فرمائش ہو رہی تھی۔ یہ تھا شاعر ہندوستان فخرِ مشرق علامہ شفیق جون پوری۔

مشاعرہ ختم ہو گیا۔ پنڈال خالی ہونے لگا۔ مگر میرے ذہن میں شفیق کے شعر ہنوز گونج رہے تھے۔ رہ رہ کر اُن کے پاکیزہ خیالات مجھ کو جھنجھوڑ دیتے تھے۔ اور میں ایک سروری کیفیت سے سرشار ہو جاتا تھا۔ بلکہ اسی کیفیت نے مجھ کو مجبور کیا کہ میں اپنا اصول کے خلاف شفیق سے براہِ راست متعارف ہوں۔ چنانچہ میں وارفتگی کے عالم میں اُس سے ملا۔ طبیعت سادہ۔ مزاج میں انکساری۔ اخلاق میں وسعت۔ دل میں خلوص۔ نظر میں حیائے انسانی اور لفظوں میں لوچ پایا۔ جس نے خصوصیت کے ساتھ میرے شوق کو لوریاں دیں۔ اور میں نے طے کر لیا کہ اب اس سے قریب تر ہونے کی کوشش کروں گا۔ اگرچہ میں اس کے مقربین کا عشر عشیر بھی نہیں لیکن شفیق ایک مکمل انسان ہے۔ اس نے میرے شوق کو اپنے دل میں جگہ دی اور میں اس سے قریب ہو گیا۔ اور اسی جذبۂ عقیدت کے ماتحت آج ان کے شاعرانہ پہلو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اگرچہ آفتاب کو روشن کہنا دانائی کے خلاف ہے۔

علامہ شفیق جون پوری آج سے نہیں بلکہ اپنی آٹھ سال کی عمر سے شعر کہہ رہے ہیں۔ اور اپنے والد محترم قبلہ ابنیق جون پوری نور اللہ مرقدہٗ کی عالی علمیت، بلند شعریت کے صحیح معنوں میں وارث ہیں۔ آپ کا ابتدائی ماحول عالمانہ تھا۔ لہٰذا مزاج کی سادگی تو ایک طرف دل و دماغ مجلی۔ خیالات پاکیزہ اور عقائد خالص مسلمانہ ہیں۔ آپ کی غزلوں کا پہلا دیوان "چمن" آپ کے سبزۂ خط سے پہلے دس سال کی عمر میں شائع ہوا۔ جس نے اہلِ جون پور ہی کو نہیں۔ خود شعری

کی بلندیوں کو اعتبار نہ آیا۔ اور آپ کی شاعرانہ لیاقتوں کو پرکھا جا رہا۔ لیکن حساب پاک از محاسبہ چہ باک کے بموجب آپ نے اپنی صلاحیتوں کے وہ جوہر دکھائے کہ دنیا والوں کے منہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے۔

موصوف کی علمی استعداد۔ ادبی مذاق اور عقائد مذہبی کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے اپنے ابتدائی مذاق میں "حید العصر" جون پور سے جاری کیا۔ حضرت صبر شاہجہانپوری کی شرکت میں روزنامہ "مشیر" کی ایڈیٹری فرمائی۔ اسی زمانے میں اپنے استاد محترم رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی کی "اردوئے معلی" کو ترتیب دینے کا بار اپنے ناتواں شانوں پر لیا۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۳ء تک کانپور سے "طارق" نکالتے رہے اور اس پر طرۂ علی طور تو یہ ہے کہ جب مولانا حسرت موہانی نے اپنے خاندان کا شجرہ شائع کیا تو اپنے شاگردوں میں صرف شفیق جون پوری کا ذکر کیا۔

اس وقت مولانا شفیق کی عمر پینتالیس سال کے قریب ہے اور تصانیف مطبوعہ و غیر مطبوعہ بھی بحیثیت مجموعی پینتالیس ہی کے قریب ہیں۔ جن میں عربی، فارسی زبانوں کے ضخیم رسائل بھی شامل ہیں۔ بعض عربی کی کتابوں پر آپ نے حواشی تحریر کئے ہیں منجملہ دیگر تصانیف کے چند کتب کے نام یہ ہیں:-

کلامِ شفیق۔ خلدِ مشرت، تجلیات۔ دار السلام۔ بہشتِ جنت مینائے حجاز۔ شاخِ غم، التاریخ الجمیل۔ بانگِ جرس، خرمنِ عشق، اخلاص مشرق، طوبیٰ شفق۔ تفسیر سورہ والفجر۔ خونِ جبین۔ سعادتِ دارین۔ الفوز العظیم، بزرگوں کی باتیں۔ تاریخ آئمہ اثنا عشریہ، نظار الحسنین۔ کاشف، مرارہ حیات ادبیۃ النساء۔ صبح کعبہ۔ انسانِ کامل الشجرۃ المبارکۃ۔ تاریخ دوازدہ امام۔ صبح حجاز، شفیق کے افسانے۔ سفینہ زندگی وغیرہ وغیرہ۔

علامہ شفیق جون پوری کو ہر صنف میں تبحر حاصل ہے۔ غزل۔ قصیدہ۔ حمد، نعت، منقبت، تاریخ۔ قطعہ۔ رباعی۔ رزم، بزم جس میں سے قصیدہ اور تاریخ میں یدطولیٰ حاصل ہے۔ اور صنف غزل میں تاریخی غزل کا اضافہ فرما کر دامن ادب کو وسیع کر دیا۔ جو اپنے تاثرات و واقعہ بندی کے اعتبار سے نہایت کامیاب اضافہ ہے۔

آپ کا رجحان طبع جیسا میں نے ابھی عرض کیا۔ خالص اسلامی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ غازی انور پاشا، شیخ سنوسی، امیر عبدالکریم، مجاہد ریف، مولانا محمد علی۔ علامہ اقبال اور رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی کے خصوصیت کے ساتھ مقلد اور متبع ہیں۔ جس کا اعتراف انہوں نے جا بجا خود کیا ہے۔

اب میں علامہ موصوف کا کلام اجمالی بحث کے ساتھ پیش کرونگا لیکن اشعار پیش کرنے سے قبل اپنی ہیچمدانی کا اعتراف کرتے ہوئے یہ عرض کردوں، کہ مولانا کے کلام کا انتخاب بہت دشوار ہے۔ ہر شعر ایک شعلہ اور ہر شعر ایک آفتاب ہے۔

مولانا حافظ شیرازی کے دیوان کی پہلی غزل کا مصرعہ ادبی ارباب نظر سے مخفی نہیں۔ مولانا شفیق نے اسی مصرع کو از راہ برکت مستعار لیکر دوسرا مصرع لگایا اور اسی زمین پر غزل فرمائی ؎

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا
کہ چوں یک جام می نوشم نمی ترسم ز مشکلہا

کہن شد داستانِ ساربان و ناقہ و محمل
باندازِ دگر خواہم سرودِ طوفِ محملہا

بنائے عشق را باکن بنائے تازہ پیدا کن
خوشا عشقے کہ باشد حسن پابندِ سلاسلہا

نہ شیرینے نہ فرہادے نہ لیلائے نہ مجنونے
نہ حسن اندر پری رویاں نہ ذوقِ عشق در دلہا

سخت زمین کو کیا زرخیز کیا اور اس پر طرہ یہ کہ آپ کے مخصوص رنگ نے آپ کا دامن نہیں چھوڑا۔

مرزا غالب اپنی مشکل پسند طبیعت کے لئے مشہور ہیں مولانا موصوف کا رنگِ سخن اور انداز بیاں اس مشکل کو بھی اپنے لئے آسان سمجھتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

اس لئے بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے
ماتمِ پروانہ مقصودِ چراغِ کشتہ ہے

اب کہاں وہ رونقِ بزمِ طرب ہنگامِ صبح
یا چراغِ کشتہ یا دودِ چراغِ کشتہ ہے

اس لئے سنتے ہیں حکمِ ارتفاعِ جلوہ ہے
بوالہوس بھی اب خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
جبکہ ہیں دیر و حرم دونوں تجلی گاہِ دوست
پھر عبث شیخ و برہمن میں نزاعِ جلوہ ہے
اپنی کم ظرفی کو ہم تسلیم کرتے ہیں مگر
بیخودی تو بھی توجہ امتناعِ جلوہ ہے

کشتۂ دار و رسن وہ رازدارِ نغمہ ہے
جس کی آوازِ اناالحق یادگارِ نغمہ ہے
نعرۂ منصور وجہِ کشتنِ منصور ہے
کیا تماشا ہے مغنی خود شکارِ نغمہ ہے

کہیں یہ شک نہیں ہوتا کہ یہ اشعار غالب کے نہیں بلکہ گمان ہوتا ہے کہ یہ دیوانِ غالب میں چھپنے سے رہ گئے ہیں۔

"اسلامیوں سے ان کی روایات چھین لو" اقبال کہہ کر خاموش ہو گیا۔ مگر ہمارا شاعر اپنی اسلامی متاعِ بردہ کو یاد کر کے ہنوز چشمِ نم ہے۔ ؎

تھی زینتِ آفاق کبھی اپنے قدم سے | اور آج وہ ہم ہیں کہ خود اک بوجھ ہے ہمارا
ہم وہ ہیں کہ چلتا تھا زمانہ کبھی ہم سے | اب غیروں کے ٹکڑوں پہ گزارا ہے ہمارا
غیروں سے نہیں کوئی گلہ ہم کو شفیق آہ | جو کچھ ہے وہ احباب سے شکوہ ہے ہمارا

واحسرتا کبھی دنیا دامنِ اسلام کی خرمن کی خوشہ چینی کرتے تھے۔ آج اسلام کو خوشہ چینی پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

جب دنیا محوِ استراحت ہوتی ہے تو شفیق جاگتا ہے اور غریب و بے نوا کے نالہائے نیم شبی کو سن سن کر روتا ہے ؎

زمانے کے مذاقِ ناشناسی سے خدا سمجھے
وفا سی شئے اور اس کی قدر دنیا میں نہیں ہوتی
غریبوں کے خدا برباد کر دے ایسی دنیا کو
جہاں مظلوم کے نالوں کی شنوائی نہیں ہوتی

یہ تہذیبِ امم، یہ نظمِ انسانی، یہ حریت
کہو اب بھی نہ قدرِ رحمۃ للعالمین ہوتی؟

"رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی" مگر اس کی وجہ شفیق کی حقیقت بیں نظروں نے تلاش کر لی ؎

عنادل میں ابھی سوزِ نوا پیدا نہیں ہوتا
بغیر اس کے ترنم میں مزا پیدا نہیں ہوتا
اذانوں میں بلالی جوش پیدا ہو تو کیونکر ہو
کہ سینوں میں دلِ درد آشنا پیدا نہیں ہوتا

اسلام پر اتہام لگایا جاتا ہے کہ اس کی تبلیغ بزورِ شمشیر ہوئی ہے۔ اور اس کو اخلاق حِلم اور ایثار سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارا اسلامی شاعر اس تہمت کی تردید میں کیا ٹھوس دلیل دیتا ہے ؎

جہاد و سرفروشی میں ہے لافانی پیام اپنا
مجاہد کا عقیدہ ہے کہ مرنا ہے حرام اپنا
اگر تلوار کی قیمت اشاعت کا سبب ہوتی
تو پھر مکہ کا فاتح کیوں نہ لیتا انتقام اپنا

علامہ اقبال کے مسئلۂ خودی اور بیخودی کی اتباع کو آپ عین انسانیت تصور فرماتے ہیں۔ اور اسی کی تقلید میں آپ کے دواوین میں اکثر اشعار نظر آتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

نہ کھونا چاہیئے احساسِ خودداری کبھی اپنا
مبارک غم مگر تیور بدل دے بے کسی اپنا
زمانے سے شکایت ہی نہ ہو، ناقدردانی کی
جو پہلے مرتبہ پہچان لے خود آدمی اپنا

مذاقِ شادی و غم تا کجا اسے خاک کے پتلے
جو ان دونوں سے بالاتر ہو ایسی بھی کوئی شے لا
شرابِ عصر میں تو بیخودی ہے نہ خودی ساقی
جو تو نے آج سے پہلے پلائی تھی وہی مے لا
من اندازِ قدت را می شناسم مرد افرنگی

کہ کپڑے صاف ہیں لیکن بدن ناپاک دل میلا

مسئلۂ خودی تو ایک طرف خود مولانا ڈاکٹر اقبال کی پیروی
پر فخر کرتے ہیں۔ ان کا تفخر انہیں کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں ؎

کسی کے زمزمے شبلیؔ کے نغموں سے سنورتے ہیں
کسی تصویر میں روسی ادب کا رنگ بھرتے ہیں
ہماری خود پسندی غیر کی تقلید کیا جانے
ہم اے اقبال تیری پیروی پر ناز کرتے ہیں

محبت کے نام پہ بدنام ہونا محبت میں چار چاند لگانا ہے
واہ ری بدنامی جس پر صدہا نیک نامیاں صدقے۔ مگر یہ منزل بہت
مشکل ہے۔ اچھے اچھے لڑکھڑا جاتے ہیں۔ بلکہ ع

تماشہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

مگر علامہ شفیق اس منزل کو بھی آسان کر لیتے ہیں ؎

خدا کی دین ہے جس کو ملے اعزاز رسوائی
محبت میں ملامت کا مقام آساں نہیں ہوتا
کبھی کافر بھی دل میں روشنی محسوس کرتا تھا
اور اب خود مرد مومن صاحب ایماں نہیں ہوتا

فاعتبروا یا اُولی الابصار

تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے" اقبال نے انسانیت
کی عکاسی کی شفیق بھی انسان ہیں ؎

تو نے گر شان بڑھائی مری پیشانی کی
میرے سجدوں نے بھی کعبہ کی نگہبانی کی
کیوں نہ کشتی کے چلانے کا طریقہ سیکھا
ہم کو دریا سے شکایت نہیں طغیانی کی

واقعی از ماست کہ برماست

"جو چاہے ظلم کرو اختیار باقی ہے" شفیق اس خیال کی
مخالفت کرتا ہے اور اس کو انسانیت سوز سمجھتا ہے۔ اس کی نظروں
میں مساوات کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ برداشت نہیں کرتا کہ غریب
نادار آفتاب کو اپنا سائبان سمجھے۔ اور صاحب سرمایہ کرۂ زمہریر
میں بھی گرمی محسوس کرے۔ کہتا ہے ؎

اپنا مذاق سب سے جداگانہ چاہیئے
جو وقت کو پلٹ دے وہ افسانہ چاہیئے
وہ جبہ سائیوں کا زمانہ نہیں رہا
مزدور کا مزاج بھی شاہانہ چاہیئے

جیسا میں نے عرض کیا کہ مولانا کے عقاید مخصوص اسلامی ہونے
کی وجہ سے آپ اسلام کی اعلیٰ شخصیتوں اور مقتدر ہستیوں کے انتہائی
معتقد ہیں۔ چنانچہ غازی اصلاح الدین کی تلمیح کے ماتحت چند
شعر ملاحظہ ہوں ؎

اگر حسن عمل ہو راستی ہو، پاک بازی ہو
بڑھے دستِ الٰہی غیب سے ہمت نوازی ہو
تیرے بیتِ مقدس کی حفاظت کیلئے یارب
مسلمانوں کا ہر بچہ صلاح الدین غازی ہو
شفیق آئی ہے روح القدس کی آواز کانوں میں
کہ اے ہندوستاں والے ترا نغمہ حجازی ہو

ایک جگہ "غازی انور پاشا کی یاد میں" لکھتے ہیں۔ چند شعر مشتے
از خروارے پیش ہیں ؎

پکار اُٹھتے ہیں اکثر جامع ایوب کے ذرے
کہ انور بے مرے مینا تم کو یاد کرتے ہیں
تمہارا تذکرہ ہوتا ہے انگورہ کی گلیوں میں
سمرنا کے گل و گلزار تم کو یاد کرتے ہیں
ہے اب تک قوم کی نظروں میں انور کیپ کی عظمت
کلاہ و جبہ و دستار تم کو یاد کرتے ہیں
جہاں دوہرائی تھی خاک حرا کی داستاں تم نے
وہ کوہ سلطنہ کے غار تم کو یاد کرتے ہیں
تمہارے کارناموں کو زمانہ ہو گیا لیکن
ابھی بلقان کے آثار تم کو یاد کرتے ہیں
تمہارے کارناموں کو زمانہ ہو گیا لیکن
ابھی بلقا ن کے آثار تم کو یاد کرتے ہیں
جو ہوتے شیخ سنوسی تو پھر تم کو صدا دیتے

چلو اسلام کے احترام کو یاد کرتے ہیں

شاعر کا مقام ارفع ہے۔ لیکن اگر اس کا مطمحِ نظر مینا و جام، حسن و شباب، گل و گلزار، ہجر و وصال اور نفسی محبت ہے۔ تو وہ شاعر نہیں۔ شفیق ایسی شاعری سے بیزار ہو کر کہتا ہے ؎

میں نے مانا ہے جمالیاتِ شاعر کا مقام
کیا جمالیات کا جائز نہیں ہے احترام؟
یہ جمالی زندگی ہے کس قدر تہذیب سوز
حاصلِ افکارِ شاعر ہو فقط مینا و جام
رندی و مستی کا حاصل ہے فقط ہیجانِ نفس
قوم کو درکار ہے شاعر کا اخلاقی پیام
کیا اسی کا نام ہے آج انقلابی شاعری
پارہ پارہ ہو رہا ہے آہ روحانی نظام
شاعری کو وسعتِ ارض و سما درکار ہے
شعر کر دیتا ہے شاعر کو خدا سے ہم کلام
شعر کا مقصد اگر جذبات کا ہیجان ہے
تُف ہے ایسی شاعری پر ایسے شاعر کو سلام

اسلام اپنے عدل و معدلت گستری کے لئے مشہور ہے انصاف اور مساوات جزو لاینفک ہے۔ اس کا انصاف موت کا انصاف ہے۔ جس کی نظر میں امیر و غریب۔ شاہ و فقیر ایک ہیں۔ انصاف خطا کو سزا دیتا ہے۔ لہٰذا اصاحبِ خطا سے کیوں مرعوب ہو شفیق اسلامی انصاف کا نمونہ پیش کرتا ہے ؎

شاہ ہو یا ہو گدا کوئی بھی شہ زوری کرے
کیوں لحاظِ رتبۂ تیموری و غوری کرے
عدل تو یہ ہے کہ قطعاً ہاتھ کاٹا جائیگا
فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی اگر چوری کرے

اپنے والد محترم مولانا انیق جون پوری مرحوم و مغفور کا رنگِ کلام اور اندازِ بیان مولانا شفیق کو بہت پسند ہے بلکہ قصیدہ تاریخ کی خصوصیت اپنے والد قبلہ سے حاصل کی ہے ؎

ابتدا سے ہے شفیق اس بات کا مجھ کو خیال
حمد و نعت و منقبت میں ہو انیقی بول چال
یادگار ان کی رہیں گی نعتیہ نظمیں مری
فاضلِ دوراں انیقِ جون پوری کا کمال

آپ کا احساسِ خودی ملاحظہ ہو ؎

بے چارگی و مظلومی کی ذلّت کو گوارا کون کرے
احساسِ خودی بیدار ہے جب دردر کی سلامی کون کرے

مولانا شفیق جون پوری کا رنگِ تغزل ایک خصوصیت کا حامل ہے ان کی غزلوں میں رکیک اور سوقیانہ مضامین تلاش سے بھی نظر نہیں آتے اور معیاری اور بازاری غزل میں انہیں سے امتیاز پیدا ہے۔ چند شعر غزل کے ضیافتِ طبعی کے لئے پیش کرتا ہوں ؎

ہمارے صحنِ چمن میں کوئی ذرا اب آئے تو غاصبانہ
نسیم آ کے گی منہ پہ دھولیں بنے گی ہر شاخ تازیانہ
عجیب حسرت سے اُن کا کہنا یہ آ کے نزدیک آستانہ
گلی میں چکر لگاؤ گے تم کیا کہے گا مجھے زمانہ!
سلام اے شاخِ گل کہاں تک رہو نگا تجھکو شریکِ آفت
چمن پہ جب اختیار ہو گا تو پھر بناؤں گا آشیانہ
خوشی کے لمحوں کا پوچھنا کیا یہ غم کی گھڑیاں بھی ہیں غنیمت
گیا ہوا دن نہیں پلٹتا ہزار گردش کرے زمانہ

اس طرح ملتے ہیں اُن کے گوشوارے بار بار
جھلملاتے ہوں سحر کے جیسے تارے بار بار
اُس گھڑی پہ پوچھ نہ منظر اُن کے خوابِ ناز کا
جب نسیمِ صبح زلفوں کو سنوارے بار بار
لے چمن کی ڈالیوں کی چھاؤں میں مستِ خرام
شوق کہتا ہے تجھے پھولوں سے مارے بار بار
چشمِ پرنم کا وہ عالم رات کا پچھلا پہر
ٹوٹ کر گرتے ہیں جب دامن میں تارے بار بار

ہر ذرّہ کو آمادۂ فریاد کیا ہے
کس درد بھرے دل سے نہیں یاد کیا ہے

جانوں گا عافیت سے ہوئی زندگی تمام
گر خیریت کے ساتھ جوانی گزر گئی

اگر زندگی کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ شفیق کے ابتدائی دو حصّے معصوم اور بے داغ ہیں مگر تیسرے حصّے میں "اگر تحفۂ بلقیس" نے آپ کی زندگی کو بدلنا چاہا تھا، کہ آپ پہلی ہی لغزش میں ہوشیار ہو گئے - پھر بھی آپ پاک دامنی کے معاملے میں لائق ستائش ہیں - میری یہ جرأت شاعرانہ اور نہ صرف شاعرانہ ہے، شفیق صاحب معاف فرمائیں ،

انسانی شرم اُس کے ظرف کا آئینہ ہوتی ہے ؎
کسی نے کی تھی سجدوں کی شکایت مدتیں گزریں
عرقِ آلودہ ہے اپنی جبینِ انفعال اب تک

طولِ شبِ ہجراں کا حسین مبالغہ ؎
وہ کہتے ہیں تو الٰہی سحر نہ ہو برسوں
خوشی کی رات کو دے زندگی شبِ غم کی

علامہ شفیق کو تاریخ نکالنے میں ملکہ ہے - چنانچہ سید نصیر الدین عادی نصیر جون پوری نوری کا قطعۂ تاریخ رحلت ملاحظہ ہو ؎

جلوۂ نور شہ نور کا پیارا نہ رہا ۱۳۵۷ھ — بزمِ نوری میں نصیر سخن آرا نہ رہا ۱۹۳۸ء
حامیٔ بیکس و مظلوم حبیبِ آفاق ۱۳۵۷ھ — دلِ نالاں کا مصیبت میں سہارا نہ رہا ۱۳۵۷ھ
صاحبِ فہم زہے سخت دلِ شاہ نصیر ۱۹۳۸ء — تنگِ نازک، فلک نور کا تارا نہ رہا ۱۳۵۷ھ
ہوئی تاریخ عیاں طبع کے مصرعہ سے
طبعِ مغموم ہیں گو نظم کا یارا نہ رہا

مختصر یہ کہ علامہ شفیق جون پوری ہر اعتبار سے ہر فن کے لحاظ سے مسلم الثبوت شاعر ہیں - مسلمانوں کو ان کا ممنون کش ہو جانا چاہیئے - اگر اسلام تناسخ کا قائل ہوتا تو دنیا کہہ اُٹھتی کہ اقبال - شفیق کے رُوپ میں پیدا ہوا ہے اس نے لاہور کی رنگینیوں سے عاجز آ کر اب کی جون پور میں جنم لیا ہے - مگران خوبیوں اور اوصاف سے متصف ہونے کے باوجود اس وقت کا اُردو ادب شفیق کے لئے اپنا دامن نہیں پھیلاتا - اس کو سر آنکھوں پر نہیں بٹھاتا اس کو گلے سے نہیں لگاتا، بلکہ اس سے بجائے نااہل اور ناکارہ کو اپنے دل میں جگہ دے رہا ہے - انہیں نواز رہا ہے - اپنی ہر محفل میں باریابی کی اجازت دے رہا ہے - میں تو کہوں گا، کہ اُردو ادب کی اس غفلت کے ذمہ دار وہ حضرات ہیں - جو اس کے آستانے کے پاسبان ہیں - جن کی اجازت کے بغیر کوئی اندر نہیں جا سکتا - خواہ اہل و مستحق ہی کیوں نہ ہو - اور وہ پاسبان جس کو خود چاہتے ہیں وہ الطاف و عنایات کا مستحق قرار دیا جاتا ہے - یہ اُردو ادب کی بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے

"مشاعرۂ شاعر"

از
محمد عثمان۔ مظفر گڑھ

رسالہ شاعر آگرہ کے جنوری، فروری مشترکہ نمبر میں کل ہند مشاعرہ بھی شائع ہؤا ہے۔ جس میں چند اساتذہ کے علاوہ اور بھی کئی پختہ مشق شاعروں کی غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ بڑی خوش اسلوبی سے مشاعرہ کی ترتیب قائم کی گئی ہے۔ کئی غزلیں ایسی ہیں، جن کے بعض اشعار مجھے بہت پسند آئے۔ یُوں تو تمام غزلیں اپنے اپنے رنگ میں بہتر ہیں مگر مجھے خصوصاً جن غزلوں کے بعض اشعار نے مسحور کیا میں انہیں کے متعلق اِس مختصر مضمون میں اپنے تاثرات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے جن اشعار کو میں نے پسند کیا ہے۔ ان کو بعض حضرات پسندیدہ نظر سے نہ دیکھیں، اس لئے میں ایسے حضرات سے اپنے اظہارِ خیال کے لئے عذر خواہ ہوں۔ کیونکہ اختلاف ذوق کی بنا پر ہر شخص مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہی نقطۂ خیال کا اظہار کرے۔

ہر شاعر کے کلام پر اظہار خیال کے ساتھ ساتھ میں چاہتا ہوں کچھ تنقیدی نوٹ بھی لکھ دوں، تاکہ میرا وہ نظریہ جو میں نے زیرِ گفتگو شعرا کے متعلق قائم کر رکھا ہے دُوسروں کو معلوم ہو جائے۔ میں اس سلسلہ میں کوئی تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ اپنے ذوق کے مطابق ہر شاعر کی خصوصیات کلام کو ظاہر کرنا چاہتا ہُوں۔ جو صرف میرے نقطۂ خیال کے مطابق ہوگی۔ وہ صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔

حضرت وحشتؔ کلکتوی

مشاعرہ حضرت وحشتؔ کی غزل سے شروع ہوتا ہے آپ کی غزل مختصر ہے۔ مگر ہر شعر اپنی جگہ شاعر کی قادر الکلامی اور پختہ مشقی کا آئینہ ہے۔ فرماتے ہیں:۔

نا اُمیدی میں بھی اُمید کی ہوتی ہے جھلک
کبھی تجھ سے تری ایسی بھی نظر ہوتی ہے

اس شعر کی خوبیوں کا احاطہ کرنے کے لئے دوسرے مصرعہ کو دیکھئے اور اس میں ایسی بھی پر ذرا گہری نظر ڈالئے۔ وسعت معنی کی انتہا نہیں۔ نفسیات حُسن عشق کے ماہر جانتے ہیں۔ کہ معشوق باوجود یکہ عاشق سے نفرت کرتا ہے۔ مگر کبھی ایسی مخصوص نظر سے عاشق کو دیکھ لیتا ہے۔ کہ جس کی وجہ سے عاشق کو سخت نا امیدی کی حالت میں کئی اُمیدیں نظر آنے لگتی ہیں۔ اس نظر کا اثر تمام تر ذوقی ہوتا ہے۔ اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔ پھر بھی شاعر نے اس کی ترجمانی کے لئے بہت عمدہ پیرایہ بیان کر لیا۔

شب ہی کہیئے اِسے جس پر نہ ہو اطلاق سحر
کیا غم آلود شب غم کی سحر ہوتی ہے

اِس شعر میں طرز بیان کی جدت نے لطف پیدا کر دیا ہے۔ شب غم کی سحر کو مشبہ قرار دیکر شبِ غم کو مشبہ قرار دیا ہے۔ یہ قادر الکلامی کا ثبوت ہے، مقطع میں فرماتے ہیں ؎

میں تو ہُوں معتقد داغ غزل میں وحشتؔ
جس کی ہر بات ہم آہنگ اثر ہوتی ہے

اِس شعر میں حضرت وحشتؔ نے خود اپنا نظریۂ شعر بیان کر دیا۔ وہ بلاشبہ غزل میں داغؔ کی پیروی کرتے ہیں صفائی زبان، سلاست اور روانی کا التزام ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ الفاظ کے مرعوب کن طلسم سے دبا کرتے ہیں اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اس کو جذبات کی اثر انگیزی اور صفائی زبان کی مدد سے پرکار بنا دیتے ہیں! اور بلند سے بلند مضمون کو صاف زبان میں ادا کر جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ان کی قادر الکلامی کی زبردست دلیل ہے۔

حضرت سیمابؔ اکبر آبادی

مشاعرہ میں دوسرے نمبر پر حضرت سیمابؔ کی غزل ہے۔ ان کے متعلق کچھ کہنا فضول ہے۔ وہ اس وقت ہندوستان کے مسلم الثبوت

اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا خوب مطلع ہے۔

جن کی جلوؤں کے اجالوں میں بسر ہوتی ہے
ان کی اِک شب میں کئی بار سحر ہوتی ہے

کتنا اچھا اُسلوب بیان ہے۔ جدت مضمون کی مثال اس سے بہتر مشکل ہی سے ملے گی۔ ایک شب میں کئی بار سحر ہونے کا مضمون کتنا مشکل تھا کیونکہ دعویٰ ناقص ہے، مگر اس کو بدرجۂ کمال یوں ثابت کیا کہ جس عاشق پر جلوؤں کا ورود ہوتا رہتا ہے۔ گویا اس کی ایک شب میں کئی بار سحر ہوتی ہے اُردو تو کیا فارسی میں بھی ایسے اشعار مشکل سے ملیں گے، پہلے مطلع میں پھر عاشق اپنا انداز مذاق علیحدہ رکھتا ہے! درعشق کی نفسیاتی حقیقت کیفیت واحدہ کی حامل نہیں ہوتی۔ اس طرح ادا کیا ہے۔

ایک عالم میں کہاں سب کی بسر ہوتی ہے
شام پروانوں کی نظروں میں سحر ہوتی ہے

زندگی میں سب کچھ ممکن ہے۔ مگر تسکین محبت ناممکن، کتنا حقیقت آفرین شعر ہے۔ یہ ایسا کلیہ ہے کہ اس کی کسی طرح تردید نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہاں بلاغت کا یہ پہلو شاعر نے مدِنظر رکھا ہے کہ دنیا والے جسے تسکین محبت کہتے ہیں یا کہہ سکتے ہیں، درحقیقت وُہ اور محبت کی آگ کو بھڑکانے والی ادا ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

زندگی کو نہیں تسکین محبت حاصل
یُوں تو ہونے کو بہر حال بسر ہوتی ہے

ان دونوں شعروں کو محبت سے بہت قریب ہو کر پڑھیئے۔

وہ ملے مجھ سے تو اُن کی بھی بھر آئیں آنکھیں
دِل ہی کو دل کی تنہا ہی کی خبر ہوتی ہے

ہائے وہ ان کا تغافل وہ میری مجبوری
صلح ہوتی نہیں منظور۔ مگر ہوتی ہے

حضرت سیماب کی تمام غزل مرصع ہے۔ اس مختصر مضمون میں اس پر تبصرہ ممکن نہیں، عام طور پر سیماب کے متعلق اہل علم کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ عہد حاضر کے ایک ایسے شاعر ہیں۔ جو تمام اصناف سخن پر پوری قدرت رکھتے ہیں بلاشبہ یہ فیصلہ صحیح ہے۔ مگر مجھے ان کی غزل بہت پسند ہے، کیونکہ انہوں نے عہد حاضر میں اس صنف کو بلحاظ وسعت مضامین بہت کچھ بلند کیا ہے۔ اور غزل کو ایک ایسی ہمہ گیر صنف بنا دیا جس میں ہر قسم کے مضامین کے بیان کرنے کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ غالب کی طرح غزل پر ان کا بہت بڑا احسان ہے۔

حضرت نوح ناروی

حضرت نوح کی غزل ان کے عام انداز کے مطابق بہت خوب ہے۔ فرماتے ہیں۔

خارِ گلشن سے نہیں دامن گل سے پوچھو
بُوند شبنم کی جو گرتی ہے گہر ہوتی ہے

یہ مضمون کہ "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" اس شعر میں خوب ادا کیا گیا ہے ایک شعر ہے ؎

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے
دن عیش کے گھڑیوں میں گزر جاتے ہیں

اس مفہوم کو حضرت نوح نے کس صفائی سے ادا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

مختصر عیش کی راتیں ہیں یہ دیکھا ہم نے
شام ہوتی ہے اِدھر صبح اُدھر ہوتی ہے

دوسرا مصرعہ خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔ زبان کی گرمی اور صفائی اور پھر اس پر روز مرہ کا التزام قابل داد ہے، یہ مضمون عام طور پر شعرا کے یہاں باندھا جاتا ہے۔ کہ عشق خود بخود پیدا ہوتا ہے ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ عشق کرنے میں عاشق کے ارادے کو دخل نہیں ہوتا۔ دیکھیئے حضرت نوح نے کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

اقتضا کہیئے اسے فطرتِ انسانی کا
لوگ اُلفت نہیں کرتے ہیں مگر ہوتی ہے

محبت کو فطرتِ انسانی کا اقتضا کہہ کر شعر کو شعر بنا دیا حضرت نوح عام طور پر مرزا داغ کی پیروی کرتے ہیں۔ اور صفائی زبان کے ساتھ ساتھ محاورہ بندی کا بھی خیال رکھتے ہیں، جہاں تک زبان کا تعلق ہے ان کے اشعار اچھے ہوتے ہیں۔

حضرت اثرؔ لکھنوی

مطلع فرماتے ہیں:-

شب وہ شب ذکر میں تیرے جو بسر ہوتی ہے
نازبردۂ آغوشِ سحر ہوتی ہے

وہ شب جو محبوب کے ذکر و تصور میں بسر ہو جائے واقعی بہت متبرک رات ہے۔ اور اس کو اگر نازپروردۂ آغوشِ سحر کہا جائے تو بالکل بجا ہے۔ مگر وہ شب نازپروردۂ آغوشِ سحر کیونکر ہوئی۔ یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں نہیں آئی۔ شاید یہ مطلب ہے کہ معشوق کا تصور و ذکر بمنزلِ سحر کے ہو۔ بہرحال شعر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر میں اس سے برابر لطف گیر ہوتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت سیمابؔ کا یہ مطلع گنگنایا ہوں ؎

جن کی جلوؤں کے اُجالوں میں بسر ہوتی ہے
اُن کی اک شب میں کئی بار سحر ہوتی ہے

محبت میں اک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ ذرّے ذرّے میں جلوۂ محبوب نظر آتا ہے۔ یہ عشق کی آخری منزل ہے۔ اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے۔

اب جہاں ڈھونڈوں ترے نقشِ قدم ملتے ہیں
اب جہاں جاؤں تری راہ گزر ہوتی ہے

کس قدر بلند شعر کہا ہے سبحان اللہ

اُن سے کہہ دو جو گلہ سنج ہیں محرومی کے
اس کی تقریب بعنوانِ دگر ہوتی ہے

مقطع زہر میں بجھا ہوا نشتر ہے۔

غمِ دوری کی خلش ذوقِ حضوری کے ساتھ
کیوں اثرؔ دل کی یونہی دل کو خبر ہوتی ہے

حضرت اثرؔ لکھنوی عہدِ حاضر کے مشہور شعراء میں سے ہیں شگفتہ بیانی اور کہنہ مشقی کلام سے ٹپکتی ہے۔ مجھے آپ کی غزلیں بہت پسند ہیں۔

حضرت ماہرؔ القادری

آپ کی غزل مختصر ہے مگر اچھی ہے۔ مطلع بہت خوب ہے۔

رازِ ہستی کی یہاں کس کو خبر ہوتی ہے
زیست اک سلسلۂ شام و سحر ہوتی ہے

زندگی کی تعریف یہ کہ وہ سلسلۂ شام و سحر سے زائد کچھ نہیں پھر رازِ ہستی کی خبر کیونکر ہو۔ انسان صرف اتنا ہی جان سکتا ہے جتنا کہ شاعر نے بتایا ہے۔ کیونکہ حدِ ادراک محدود ہے اور رازِ ہستی بیرونِ ادراک۔ اس شعر میں یہاں کا لفظ بُری طرح کھٹکتا ہے۔

لحظہ لحظہ یہ توجہ، یہ نوازش، یہ کرم
اب جفا چھپ بعنوانِ دگر ہوتی ہے

یہ شعر نفسیاتِ حسن و عشق کی ترجمانی کرتا ہے کبھی معشوق عنایت بھی کرتا ہے۔ تو عاشق کو کچھ اور ہی گمان ہونے لگتا ہے غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

"کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور"

حضرت ماہرؔ نے دوسرا مصرعہ اچھا لگایا ہے۔ کیا خوب فرمایا ہے:-

میں تری یاد کو اے دوست دعا دیتا ہوں
زندگی غم میں بھی راحت سے بسر ہوتی ہے

فرقت میں یادِ محبوب مہجور عاشق پر کتنا کرم کرتی ہے۔ اس خیال کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ اندازِ بیان نہایت دلچسپ اور مؤثر ہے۔ اس شعر کو پڑھتے رہیئے اور لطف اندوز ہوتے رہیئے۔

ٹھوکروں ہی سے تو ملتا ہے سراغِ اُلفت
ظلمتوں ہی سے نمودارِ سحر ہوتی ہے

اس شعر میں درس و حقیقت دونوں ہی دست و گریباں ہیں مصیبت کے بعد راحت نصیب ہوتی ہے۔ لہٰذا انسان کو موانعِ راہ سے نہیں گھبرانا چاہیئے۔ حضرت ماہرؔ بہت پرگو اور سنجیدہ شاعر ہیں۔ غزل و نظم دونوں اچھی کہتے ہیں۔ مگر غزل میں کبھی کبھی ایسے مضامین بھی لکھ جاتے ہیں۔ جو غزل سے جوڑ نہیں کھاتے۔ اسی غزل میں ایک یہ شعر موجود ہے

ناپسند آیا مشیت کو جوابِ ابلیس
ایسی تاویل سے توہینِ بشر ہوتی ہے

شعر اچھا ہے مگر غزل میں نہیں سجتا، اس لئے کہ اس میں تغزل نہیں۔ آج کل حضرت ماہر پر اقبال کا اثر ہے اور وہ زیادہ تر اس رنگ میں کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خدا ان کو کامیاب کرے مگر بہتر تو یہی تھا، کہ وہ اپنے فطری انداز کی تکمیل کرتے۔ جس طرح پہلے غالب کی تقلید میں بہت شاعر گمراہ ہوئے، اسی طرح عہدِ حاضر میں دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے اچھا کہنے والے شاعر اقبال کی پیروی کر کے اپنے گھر کی پونجی بھی برباد کر لیتے ہیں۔

حضرت آلمؔ مظفر نگری

حضرت آلم کی تمام غزل مرصّع ہے اور ہر شعر اپنی جگہ کی خاص کیفیت کا حامل ہے۔ تعمیر و تخریب کا سلسلہ ہستی میں ہر لمحہ جاری ہے۔ آنِ واحد میں یہ سلسلہ کتنی صورتوں میں انقلاب پذیر ہوتا ہے۔ کون جان سکتا ہے۔ شاعر ایک مشاہدے کی بنا پر کہتا ہے۔

خاک پروانے ہوئے بجھ گئی شمعِ محفل
کتنی ویرانیوں کے بعد سحر ہوتی ہے

لفظ "کتنی" پر بڑا زور ہے۔ یہاں پروانہ اور شمع کے پردے میں کتنے عالم چھپے ہوئے ہیں۔ ذہنِ انسانی ان کا احاطہ بھی نہیں کر سکتا۔ وسعتِ معنوی کے لحاظ سے یہ شعر بہت بلند ہے اور تغزل کی حد سے باہر بھی نہیں۔ ایک قادر الکلام شاعر کو اسی طرح شعر کہنا چاہیئے۔

گل ہیں محفوظ خزاں سے نہ ستارے نہ قفس
کتنی بے ضابطگی شام و سحر ہوتی ہے

خوبیِ الفاظ سے قطع نظر کرتے ہوئے معنوی مفہوم پر نظر ڈالئے کہ پستی و بلندی عالم میں ایک شے بھی شاعر کو ایسی نظر نہیں آتی۔ جو تغیر و زوال سے محفوظ ہو اور وہ اس تمام انتظامِ فطرت یا قانونِ قدرت کو بے ضابطگی کہہ کر فرضِ شاعرانہ ادا کر جاتا ہے۔ العظمۃ اللہ کس قدر بے پناہ شعر ہے۔ ان اشعار کی خوبیوں کو کچھ وہی جان سکتے ہیں۔ جو مذاق شعر رکھنے کے باوجود علومِ متداولہ کے بھی مالک ہوں۔

عشق کو راس نہیں صحبتِ افسردہ مزاج
پھر رگِ سنگ میں کیوں رہ جائے شرر ہوتی ہے

اس شعر میں حقیقت و استعجاب کے کئی پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے وہ تجربہ کی کسوٹی پر کسے ہوئے ہیں۔ جن سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

دُور بین انسان حالات و واقعات کی ہر ابتدا سے انتہا کو معلوم کر لیتے ہیں۔ اسالیب کی علامتوں سے نتائج تک پہنچ جاتے ہیں اور اکثر اُن کی رائے درست ثابت ہوتی ہے اور ان کا ہر عمل ہونے والے نتائج کا آئینہ ہوتا ہے۔ اسی خیال کو شاعرانہ انداز میں کس خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔

وقت پر ہوگا وہی باغ میں سرگرم فغاں
آمدِ گل کی پہلے جسے خبر ہوتی ہے

آپ کے اور بھی کئی شعر تبصرے کے قابل ہیں۔ مگر اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں۔ حضرت آلم عہدِ حاضر کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ قدیم و جدید راہوں کے بین بین راستہ اختیار کرتے ہیں۔ زبان و فن کے لحاظ سے عہدِ حاضر کے ہمنوا ہیں۔ یہ آپ کی صحتِ نظر کا کرشمہ ہے۔ آپ غزل و نظم دونوں پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ اور زبان و فن کے لحاظ سے استادی کا درجہ رکھتے ہیں۔

ان اساتذہ کے علاوہ اور بھی مشہور شعراء اس مشاعرے میں شریک ہیں خصوصاً حضرت آدیب مالیگانوی کی مسلسل غزل بہت خوب ہے مجھے ان کی تمام غزل پسند آئی۔ ادیب صاحب بھی بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ اور ان کے اکثر اشعار قابلِ داد ہوتے ہیں اور حضرات شعراء کی غزلوں سے ایک ایک دو دو شعر جو مجھے پسند آئے ان کو نقل کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو۔

جناب ضیا فتح آبادی

ہائے ہمت مجھے لے جائے گا تا منزلِ شوق
یوں تو دُشوار ہر اک راہ گذر ہوتی ہے

جناب شفیق ٹونکی

دشمنِ حوصلہ تابِ نظر ہوتی ہے
جانتا ہوں تیری اک یہ بھی نظر ہوتی ہے

جناب حکیم راغب مرادآبادی

دلِ مظلوم سے ملتا ہے سہارا جس کو
وہ فغاں بھی کہیں محروم اثر ہوتی ہے

جناب نثار اٹاوی

تیرے قربان میری طرف ندامت سے نہ دیکھ
یونہی فریاد پشیمان اثر ہوتی ہے

جناب مضطر گجراتی

دیکھنے والے کبھی غایت جلوہ بھی سمجھ
دیکھنے سے کہیں تکمیل نظر ہوتی ہے

جناب حکیم عبدالکریم ثمر

غیر محدود جب انساں کی نظر ہوتی ہے
پھر مقامات محبت کی خبر ہوتی ہے

جناب نظیر لدھیانوی

کس کو انکار ہے قدرت کی غلط بخشی سے
زندگی خار کی جھولیوں میں بسر ہوتی ہے

جناب رئیس امروہوی

ان کی فرقت میں بھی رفتار زمانہ ہے وہی
شام ہوتی ہے، شب ہوتی ہے سحر ہوتی ہے

جناب صابر اکبرآبادی

عشق کی چاندنی راتیں تھیں بڑی پُرامید
وقت سے پہلے سمجھا تھا سحر ہوتی ہے

جناب مرزا عالمپوری

بیخودی میں بھی خودی پیش نظر ہوتی ہے
ہاتھ اُٹھتے ہیں تو دامن کی خبر ہوتی ہے

جناب بیتاب کالپوری

ہم تیری یاد میں ہوتے ہیں جہاں سے رخصت
دیکھ اس طرح شب غم کی بسر ہوتی ہے

جناب فارغ اودے پوری

رات دن پیتی ہے گو خون تمنا فارغ ✦ سیر نیت بھی نہیں غم کی مگر ہوتی ہے

جناب خلیل کولاری

آدمیت بھی بڑی چیز ہے انساں کیلئے
آدمیت ہی سے توقیر بشر ہوتی ہے

جناب حرمت الاکرام رضوی

غم کی یہ کون سی منزل ہے خدا ہی جانے
درد اُٹھتا ہے نہ اب آنکھ ہی تر ہوتی ہے
وہ دُعا جس میں نہ ہو شانِ دُعائے حرمت
پُراثر ہو کے بھی محروم اثر ہوتی ہے

جناب اصغر صاحب نثار

رنگ لا کر رہا پروانۂ مظلوم کا خون
شمع کی راکھ سے تعمیر سحر ہوتی ہے

جناب ظہیر فتحپوری

تھے کبھی پیش نظر کون و مکاں کے جلوے
اب تو ہلکی سی جھلک بار نظر ہوتی ہے

جناب تصور کرتپوری

خواب پھولوں کے ہیں کانٹوں پہ گزر ہوتی ہے
عمر یوں تیری محبت میں بسر ہوتی ہے

جناب زاہد دھولپوری

آہ مظلوم ہم آغوش اثر ہوتی ہے
گو ذرا دیر سے ہوتی ہے مگر ہوتی ہے

جناب منظر جان پوری

ہوش میں رہ کے تجھے کوئی نہیں پا سکتا
کچھ تیرے بیخبروں ہی کو خبر ہوتی ہے

جناب قاضی سیتا نگری

میں تمہاری نگہِ لطف کو زحمت کیوں دوں
زندگی درد و الم میں بھی بسر ہوتی ہے

جناب سہیل متھراوی

موج کی آدرنہ طوفاں کی خبر ہوتی ہے
ڈوبنے والے کی ساحل پہ نظر ہوتی ہے

دل کی دھڑکن ترا پیغام سناتی ہے مجھے
تجھ سے پہلے تیری آمد کی خبر ہوتی ہے

آخر میں جناب ادیب مالیگانوی کی غزلِ مسلسل کے چند شعر لکھ کر مضمون کو ختم کرتا ہوں:-

جب سے خورشید جمالوں میں بسر ہوتی ہے
شام ہوتی ہے میرے گھر میں سحر ہوتی ہے

دیکھتا رہتا ہوں سو رنگ کے جلووں کی بہار
اور اس رنگ سے تزئینِ نظر ہوتی ہے

یوں برستے ہیں تبسم کے چمکتے ہوئے پھول
جس طرح بارشِ الماس و گہر ہوتی ہے

علم و ادراک کی آنکھیں نہیں محرم جس کی
وہ تجلی تہِ دامانِ اثر ہوتی ہے

"شباب کے بعد"

(جناب جرم محمد آبادی)

سکون کیوں نہ میسر ہو انقلاب کے بعد
زمانہ راہ پہ آتا ہے انقلاب کے بعد

کشش بڑھےگی محبت کی انقلاب کے بعد
قریب اور کوئی ہوگا اجتناب کے بعد

صلاحِ عقل کی اپنی جگہ مسلّم ہے
مگر یہ بار اٹھاؤں گا میں شباب کے بعد

ہماری راہ لگا جو وہ کامیاب ہُوا
چراغ جلتے رہے دورِ آفتاب کے بعد

نہ پوچھ کیفیتِ لذتِ شباب نہ پوچھ
کوئی شراب نہ پی میں نے اس شراب کے بعد

نکل ہی آئیں گی اے قصدِ ہمکلامیٔ شوق
سوال کرنے کی گنجائشیں جواب کے بعد

بغیر دھوپ کے چھاؤں کی قدر کیا ہوتی
کرم کی شان دوبالا ہوئی عتاب کے بعد

تمہیں بتاؤں تو شاید سمجھ میں آجائے
غمِ حساب ہے کیوں لطف بےحساب کے بعد

ابھی تو جرم ہی کہہ کر نوازتے ہیں مجھے
نہ جانے کیا وہ بتائیں گے اس خطاب کے بعد

افسانہ

کشمیر کے مرغزاروں میں

از
محترمہ حسن آرا قریشی

گلیشئر کی حسین و پرکشش وادی میں میں نے اُسے پہلے پہل دیکھا۔ کسی خیال میں کھوئے ہوئے۔ وہ سبزہ زار کے فرش پر بیٹھی تھی آفتاب کی اولین کرنیں اُس کے سنہری بالوں سے کھیل رہی تھیں۔ ایک لمحہ کے لئے میں مبہوت سا رہ گیا۔ برف کی مانند میں ٹھنڈی ہوا میں کپکپا رہا تھا۔ لیکن وہ گرد و پیش سے بے نیاز بیٹھی کسی گہری سوچ میں تھی۔ میں دریچے سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ سامنے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پہ آفتاب کا عکس قوس و قزح کا منظر پیش کر رہا تھا۔ شبنم کے قطرے سبزہ زار کے فرش پر موتیوں کی طرح درخشاں تھے میں بنگلے کے پھاٹک پہ آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ وہاں سے اور بھی قریب نظر آ رہی تھی۔ میں نے اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے سیٹی بجائی یک لخت اُس نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر نگاہیں میرے بنگلے کی طرف اُٹھا دیں۔ اُف نگاہوں کے تصادم سے سنسناتی ہوئی بجلی سی میرے رگ و پا میں کوند گئی۔ کتنی پرکشش تھیں وہ سحر آفریں نگاہیں۔ پتہ نہیں کیوں کسی غیر اختیاری جذبہ کے ماتحت میرے قدم اُس کی طرف اُٹھنے لگے۔ ایک غیر مرئی کشش مجھے کھینچ رہی تھی۔ میں خراماں خراماں اُس کی طرف جا رہا تھا۔ اُس نے میری طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا اور اُٹھ کر نیچے ترائی کی طرف جانے لگی۔ اُس نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ نیلی آنکھوں میں معصوم جذبات جھانک رہے تھے۔ اُف کیسی مخمور جوانی تھی۔ اُس کی نئی نئی صبح کی مانند نکھری ہوئی بے داغ۔ میری نگاہوں نے دُور تک اُس کا تعاقب کیا۔ وہ نیچے ترائی میں ننھی مُنی گڑیا کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ پیچ و خم کھاتے ہوئے راستوں میں اوجھل

نشیب

ہوگئی۔ میں نے محسوس کیا۔ جیسے میں کوئی دلکش اور سہانا خواب دیکھ رہا تھا۔ جو آنکھ کھل جانے کے باعث ادھورا رہ گیا ہو۔ جب سے کشمیر آیا تھا ایک دفعہ بھی گلیشئر کی وادی میں سیر نہ کر سکا۔ متواتر دس دن بارش ہونے کے بعد آج سورج نے شکل دکھائی تھی۔ میں واپس آ گیا۔ چائے تیار تھی۔ سامنے دریچے سے وادی کے دلکش مناظر روح میں بالیدگی پیدا کر رہے تھے۔ چشموں کے زیر و بم کی سحر آفریں آواز جیسے کوئی دھیرے دھیرے گنگنا رہا ہو۔ میرے خیالات دُور فضاؤں میں پرواز کر رہے تھے۔ وہ نیلی آنکھیں میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھیں۔ میں ہر روز وادی کے تین چار چکر لگاتا لیکن وہ مجھے دکھائی نہ دی۔ کلیوں کی دلکش مسکراہٹ۔ سرسراتی ہوئی ہوا کے جھونکے سب مل کر مجھے اُس کی یاد دلاتے۔ ایک دن دوپہر کے وقت جب مزدور لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ میں قریب ہی ایک پہاڑ پر ٹہلتا ہوا جا نکلا۔ وہیں ایک چشمے پر وہ اپنی تمام دلکشیوں سمیت میرے سامنے کھڑی تھی۔ ارے تم! میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔ اُف میں نے دیکھا۔ خون کی ایک پتلی سی دھار اُس کے انگوٹھے سے نکل کر چشمے کے پانی میں مل رہی تھی اور وہ حیران ہوئی انگوٹھے کو دیکھ رہی تھی۔ آس پاس مٹی کے گھڑے کے چند ٹکڑے انگوٹھے کے زخمی ہونے کی داستان بیان کر رہے تھے۔ اُس کا حسین چہرہ لمحہ بہ لمحہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ قبل اس کے کہ میں اُسے آگے بڑھ کر تھام لیتا۔ وہ نیم بیہوش سی ہو کر گر پڑی۔

انگوٹھے سے خون برابر اُسی رفتار سے نکل رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر مزدوروں کو آواز دی۔ وہ سب بھاگے ہوئے آ رہے تھے

اَرے یہ تو زینی ہے بُوڑھے گُل خان کی بیٹی۔ وہ سب اُسے نفرت
بھرے انداز سے دیکھ رہے تھے۔ بابوجی آپ ذرا ادھر آجایئے۔ یہ خود
ہی اُٹھ کر چلی جائے گی اور پھر وہ مُسکرا مُسکرا کر اشاروں میں باتیں کرنے
لگے میں نے اپنا ریشمی رومال اُس کے پاؤں پر باندھ دیا۔ چند منٹوں
کے بعد وہ ہوش میں آگئی۔ اُس نے میری طرف بڑی بیچارگی سے دیکھا
اور گھبرا کر گلے میں لپٹی ہوئی اوڑھنی کو سنوارنے لگی۔ اسی اوڑھنی
میں اُس کا جھانکتا ہوا چہرہ کتنا دلفریب نظر آرہا تھا جیسے بادلوں
میں چاند مُسکرا رہا ہو۔ گھڑے کے ٹھیکروں کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں
میں آنسو آگئے میں پریشان سا ہو گیا۔ کیا تمہارے انگوٹھے میں بہت
درد ہو رہا ہے میں نے ملائمت سے پُوچھا نہیں یہ گھڑا جو پھوٹ
گیا۔ اب چچی مجھے گالیاں دیگی۔ اتنے میں گُل خان ہانپتا ہُوا آگیا۔
کیا ہُوا بیٹی تمہارے انگوٹھے پر اُس نے گھبرا کر پُوچھا۔
کچھ نہیں چاچا۔ پانی بھر کر جانے لگی تھی پتھر سے پاؤں
پھسل گیا۔ ارے تیرے کہیں اور تو چوٹ نہیں آئی۔ نہیں اُس
نے سر ہلا کر کہا اور پھر رومال کھولنے لگی۔ ایسا مت کرو۔ میں نے
اُس کا مرمریں ہاتھ پکڑ کر کہا۔ لانبی لانبی سفید اُنگلیوں پہ میری نگاہیں
جم کر رہ گئیں۔ اچھا تو بیٹی تیرے پاؤں پر بابوجی نے باندھی ہے
کتنے اچھے اور رحم دل ہیں ہمارے بابوجی۔ بوڑھا نگاہوں سے
اظہار تشکر کر رہا تھا۔ چل میں تجھے گھر چھوڑ آؤں۔ اُس نے اُسے سہارا
دیتے ہوئے کہا۔ کیا یہ تمہاری بیٹی ہے، میں نے بُوڑھے سے پوچھا۔
ہاں کہہ کر وہ پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ اُس دن میں اپنے دل میں ناقابل
فہم مسرت محسوس کر رہا تھا۔ ہوا کسی الّھڑ حسینہ کی طرح پھولوں سے
چھیڑ چھاڑ کرتی ہوئی جا رہی تھی۔ اُس رات میں نے بڑے
رومان انگیز خواب دیکھے۔ صبح گل خان جب کام پر آیا، تو میں نے
اُس سے زینی کا احوال پُوچھا، کہ اب زینی کے انگوٹھے کی کیسی حالت
ہے۔ کیا بتاؤں بابوجی بیچاری ساری رات نہ سو سکی۔ بوڑھے نے
ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ شام کو میں گل خان کے ساتھ اُس کے
گھر گیا۔ زینی کی مزاج پُرسی کے واسطے میرا خیال تھا وہ ایک
دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ میرا خیر مقدم کرے گی میں مسکرا
کر اُس کی طرف دیکھوں گا۔ پھر وہ میرے قریب آکر بیٹھ جائے گی۔
جیسے جیسے اُس کا گھر قریب آرہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن
بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں ہم داخل ہوئے۔
ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے مجھے تیز نظروں سے گھورا، پھر وہ
بڑبڑاتی ہوئی گائے کو چارہ ڈالنے چلی گئی۔ زینی سہمی ہوئی نظروں
سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ تم کیوں یہاں آگئے، اُس کی نگاہیں اس کی
زبان کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ کیا حال ہے تمہارے پاؤں کا میں
نے مُسکرا کر کہا۔ اچھا ہے۔ اُس نے بے التفاتی سے کہا۔ دہکتی
ہوئی آگ کی روشنی میں اُس کا چہرہ گلنار کی طرح سُرخ تھا سیاہ
چمکتی ہوئی آنکھوں کی گہرائیوں میں افسردگی خندہ زن تھی۔ جتنی دیر
تک میں وہاں بیٹھا۔ میری نگاہیں اُس کے شمع رُخ کا پروانہ بنی رہیں
لیکن وہ تو جیسے بس گوشت و ہڈی کا مجسمہ احساسات سے خالی۔
جذبات سے خالی۔ وہ آسمان پر چاند کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہی
تھی نہ جانے پرے پہاڑوں سے پرے اُس کی نگاہیں کیا ڈھونڈھ
رہی تھیں بیٹھے بیٹھے اُس نے دو ایک گہری سرد آہیں لیں پھر
اُوڑھ کر ایک شکستہ سی چارپائی پر لیٹ گئی۔ گل خان محبت بھری
نظروں سے اُسے تک رہا تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی میں چلنے
کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ بڈھا میرے ساتھ میرے بنگلے تک
چھوڑنے آیا۔ آج رات نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ خیالات منتشر ہو
رہے تھے۔ زینی کی بے التفاتی نے میری جولانیوں پہ گہرا اثر ڈالا۔
دل مختلف خیالات کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ شاید حالات اُسے
مجھے ملنے نہ دیتے ہوں گے۔ یا اسے کسی اور سے محبت ہو گی۔
یہ خیال آتے ہی دل سینے میں ڈوبنے لگا۔ اور میں اس وحشت انگیز
خیال کو بھلانے کے لئے قریب ہی الماری سے ایک گیتوں کی کتاب
اُٹھا کر پڑھنے لگا۔ خنک اور ٹھنڈی ہوا کے پیہم تھپیڑے دریچے سے
آ آ کر جذبات کو گرما رہے تھے۔ نہ جانے کب پڑھتے پڑھتے مجھے نیند
آگئی۔ صبح جب بیدار ہوا تو دس بج چکے تھے۔ اتوار کا دن تھا چائے
پی کر گلیشئر کی وادی میں جا پہنچا۔ یاسمن کی مُسکراتی ہوئی کلیاں دعوت
نشاط دے رہی تھیں۔ نقرئی چشموں کے راگ روح کو برما رہے

تھے۔ ساری کائنات مست و بیخود ہوئی جا رہی تھی۔ وہ سارا دن میں نے وادی میں گھومتے ہوئے گزارا۔ سورج پہاڑ کی اوٹ میں چھپ رہا تھا اور اس کی ارغوانی کرنیں پہاڑوں کی چوٹیوں سے گلے مل کر رخصت ہو رہی تھیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ مصروف رقص تھا۔ کس قدر کیف آور ہیں اور کتنا نظر فریب تھا یہ منظر۔ یوں ہی میں مناظر کی سحرافروزیوں سے لطف اندوز ہوتا ہوا اُن جھاڑیوں کے قریب چلا گیا۔ جہاں میں نے زینی کو دیکھا تھا۔ کسی کے ہلکے ہلکے قدموں کی چاپ نے مجھے چونکا دیا میں نے گھوم کر دیکھا، زینی کھڑی تھی۔ وادی کی دلکش کلیوں سے بھی زیادہ خوبصورت اور حسین لگ رہی تھی۔ خلاف توقع اُسے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ خوشی سے جھومتا ہوا دل سینے میں دھڑک اُٹھا، کیسے آگئی ہو ادھر میں نے ہنس کر کہا میں تو روز ہی ادھر آتی ہوں، اُس نے سنجیدگی سے کہہ کر نظریں میری طرف اُٹھائیں۔ میں نے دیکھا۔ ساکن مگر مضطرب آنکھوں میں ہزاروں اُمنگیں اور آرزوئیں دم توڑ رہی تھیں۔ آؤ سامنے پہاڑ کی چوٹی پر چلیں وہ بغیر کچھ کہے میرے ساتھ چلنے لگی، دیکھو زینی یہ بنفشہ کے پھولوں سے لدی ہوئی چوٹی کتنی اچھی لگ رہی ہے اور تم اس شام کے جھٹپٹے میں کتنی حسین نظر آ رہی ہو۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ اُس نے نگاہیں جھکا لیں۔ اُس کے رخسار گھر سے گلابی ہو گئے۔ ہاں سارے گلینیٹر میں یہ چوٹی سب سے زیادہ خوبصورت ہے اُس نے بات کا رُخ پلٹنے کے لئے کہا۔ چوٹی سے دریائے جہلم کا پانی چاندی کی پتلی سی لکیر کی طرح نظر آ رہا تھا۔ ہم دونوں چوٹی سے اُتر کر دریائے جہلم کے کنارے آ گئے۔ فضا ہلکے ہلکے ترنم میں ڈوبی جا رہی تھی میں نے ایک چھوٹی سی کشتی کنارے سے کھولی اور اُسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ میرے زیادہ اصرار سے وہ نیم رضامند سی ہو گئی۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اُسے کشتی کی جانب کھینچا اور ایک لطیف دھچکے سے میرے چوڑے چکلے سینہ سے ٹکرائی۔ میں نے اُسے بازوؤں میں سنبھال لیا۔ وہ زخم خوردہ ہرنی کی طرح تڑپ کر میری آغوش سے علیحدہ ہو گئی۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ کشتی جہلم کی سطح پر ہچکولے کھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ مبہم گنگناہٹوں اور لغزشوں کے ساتھ ستار کے مخمور کن نغموں کی طرح مست کرتی ہوئی۔

زینی آج کی گھڑی کتنی مسرور انگیز ہے۔ یہ کائنات۔ یہ اُونچے پہاڑ۔ یہ کشتی کے چپّوں کی مسلسل گنگناہٹ۔ کیا تمہیں مسحور کرنے کیلئے کافی نہیں۔ ایک دفعہ مسکراؤ۔ میں ان شہابی ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنے کے لئے کتنا بیتاب ہوں۔ زینی میں یہ تمہیں کیسے بتاؤں میں تم سے یہ کیسے کہوں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ ایک دفعہ تو مسکراؤ۔ اُس کی نگاہیں پھر اُس اونچی سی چوٹی کی طرف اُٹھ گئیں۔ جیسے وہ کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔ دو موتی سے آنسو اس کی غزالی آنکھوں سے مچل کر گالوں پر بہنے لگے۔ لیکن زینی تم رو رہی ہو۔ یہ کیا میں نے اُسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش تھی۔ کیا مجھے اپنے رونے کا سبب نہیں بتاؤ گی۔ وہ اب بھی خاموش تھی اچھا تمہاری مرضی۔ میں تمہیں مجبور تھوڑا ہی کرتا ہوں۔ میں نے افسردہ ہو کر کہا۔ اُس نے آہ بھر کر کہا۔ ایسا ہی ایک موقع پہلے بھی آ چکا ہے۔ جب شہباز مجھے ٹھکرا کر چلا گیا تھا۔ کون شہباز۔ میرے جیسے کسی نے گولی مار دی ہو۔ وہ ہی زمیندار کا لڑکا۔ کیوں چھوڑ کر چلا گیا تمہیں میں نے دوبارہ استفسار کیا۔ اِس لئے کہ میں کسی پنجابی کی بیٹی ہوں میں تم سے زیادہ بولتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ کہیں تم بھی مجھے شہباز کی طرح چھوڑ کر نہ چلے جاؤ۔ اچھا تو تم کسی پنجابی کی لڑکی ہو۔ ہاں! اس نے افسردہ ہو کر کہا۔ کیا تمہاری ماں نے کسی پنجابی سے شادی کی تھی میں کچھ نہیں جانتی۔ چاچا سے پوچھ لینا۔ پنجابی تو میں بھی ہوں۔ تم بھی پنجابی ہو۔ اُس نے سہم کر کہا اور پھر وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے تسلی دیکر چپ کرایا۔ دیکھو زینی سب پنجابی ایک طرح کے نہیں ہوا کرتے۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی۔ میں نے اُس کے سر کو شانے سے لگا لیا۔ سیر کرتے کرتے ہمیں تقریباً شام ہو گئی۔ میں اُسے چھوڑ کر اپنے بنگلے کی طرف آ رہا تھا۔ اُچھلتا، گنگناتا ہوا۔ زینی سراپا میری آنکھوں میں گھوم رہی تھی۔ دل چاہتا تھا ایسا دلکش گیت گنگناؤں کہ ساری فضا بیخود ہو کر جھوم اُٹھے۔ دوسرے دن میں پھر اُن کے گھر گیا۔ گل خان حقہ پی رہا تھا۔ اور ہم دونوں

چارپائی پر بیٹھ گئے۔ زیبی شاید پانی بھرنے گئی ہوئی تھی۔
بابا ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ کیا زیبی تمہاری ہی بیٹی ہے۔ میں نے
بوڑھے گل خان سے پوچھا۔ گل خان نے حیرت سے میری طرف
دیکھا اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ بابوجی یہ داستان بڑی
لمبی ہے۔ کیا کریں گے آپ سُن کر۔ نہیں میں سب کچھ سننا چاہتا
ہوں۔ آخر لوگ کیوں اس سے اتنی نفرت کرتے ہیں۔ میرے
پیہم اصرار سے گل خان نے کہنا شروع کیا۔ بے شک زیبی ایک
پنجابی کی ہی بیٹی ہے۔ وہ یہاں سیر کی غرض سے آیا تھا۔ بے حد
خوبصورت نوجوان تھا۔ وہ بھرے بھرے بازو۔ لانبا قد۔ دودھ
کی طرح سفید رنگت۔ جب وہ گھومتا ہوا کبھی ادھر آ نکلتا تو سارے میں
راستے میں چمپا سی مہک اُٹھتی۔ گلیشیئر کی الھڑ کنواریوں کے دل سینہ
دھڑک کر رہ جاتے۔ زیبی کی ماں جو ایک گڈریئے کی لڑکی تھی گلیشیئر
میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ بابوجی۔ وہ چہکتی ہوئی کلیوں سے
بھی زیادہ حسین اور معصوم تھی۔ اکثر وہ پہاڑ کی اُس ٹیکری کی طرف کھڑی
دیکھتی۔ جہاں سے وہ بہر کو جایا کرتا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے
کو دیکھا۔ آنکھوں سے دل کے پیغام سنا دیئے۔ پھر انہوں نے
کتنے ہی محبت کے دلکش گیت مل کر گائے۔ آخر ایک پورنماشی کی
رات کو دونوں نے شادی کر لی۔ گویا اب وہ کلی سے پھول بن چکی
تھی۔ لیکن ایسا پھول جو بادسموم کے ایک ہی جھونکے سے مرجھا
جائے۔ اُسے اپنی غلطی کا احساس تب ہوا۔ جب وہ ایک تاروں
بھری رات کو اُسے تنہا چھوڑ کر پنجاب واپس چلا گیا۔ وہ بے یار و مددگار
تھی۔ لوگ اُسے نفرت سے دھتکار دیتے اور اس کے نکاح کو بھی
مذاق سمجھنے لگے۔ ۹ مہینوں کے بعد زیبی پیدا ہوئی۔ مگر اس کی ماں بچی
کی پیدائش کے بعد ایک دن بے چین ہو کر جو اُٹھی تو جھیل میں جا کر ڈوب
مری! اب میں نے ہی زیبی کو پالا ہے۔ اور تو اور میری بیوی بھی اس غریب
سے سخت نفرت کرتی ہے۔ یہ شہباز بھی اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ بوڑھے
نے حقے کا آخری کش کھینچ کر کہا۔ فضا پر ایک غم آلود خاموشی لحظہ بہ لحظہ
چھا رہی تھی۔ کتنی غم انگیز ہے یہ کہانی۔ لیکن زیبی سے کیوں نفرت کی جائے
اُس کا کیا قصور۔ میں نے گل خان کو جواب دیا تھا۔ ...... یہی تو میں

سوچ رہا ہوں۔ اتنے میں زیبی آ گئی اس کے ساتھ گل خان کی بیوی
تھی۔ کتنی بُری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے میں کوئی
مجرم ہوں اور میرے خوابوں کی رانی۔ میری زیبی کی آنکھوں میں آنسو
چمک رہے تھے۔ شاید اپنی بیچارگی و بے بسی پر۔ تمام رات میں خیالات
کی اُدھیڑبُن میں مصروف رہا۔ اگر میں زیبی سے شادی کر لوں۔ معاً
میرے دل میں خیال آیا۔ شاید بیچاری کی سوگوار جوانی مسرت و اطمینان
میں بدل جائے۔ سچ مچ میں نے محسوس کیا۔ جیسے زیبی پلنگ پر گھونگھٹ
نکالے میری دُلہن بنی بیٹھی ہے۔ کمرہ کسی دلفریب خوشبو سے مہک رہا
ہے۔ میں نے تہیہ کر لیا۔ کہ ضرور گل خان کو اس بات پر راضی کروں گا۔ صبح
میرے نام لاہور سے تار آیا۔ میرے آفیسر نے مجھے ایک ضروری کام
کے لئے بلایا تھا۔ میں زیبی کو اطلاع دیئے بغیر ہی لاہور روانہ ہو گیا۔ کشمیر
کی نشاط انگیز فضائیں میرے لئے بے کیف ہو کر رہ گئیں۔ دل ہر وقت
زیبی کی یاد میں تڑپتا رہتا۔ ایک مہینہ کے بعد میں واپس کشمیر آیا۔ کشمیر کی حسین
ہوئی وادیاں مجھے مجبور کر رہی تھیں۔ کہ میں کچھ دن اور ٹھہر جاؤں۔ لیکن پتہ نہیں
کیوں دل مضطرب تھا۔ ایک درد   میرے دل میں رہ رہ کر
اُٹھ رہی تھی۔ جیسے جیسے گلیشیئر کی وادی قریب آ رہی تھی۔ میرے دل و
دماغ پر زیبی کا خوشگوار تصور چھا رہا تھا۔ آنکھیں کتنی اچھی ہیں۔ جب
وہ لانبی لانبی پلکیں اُٹھا کر دیکھتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے
جھوم کر ستار اُٹھا لیا ہو۔ یا کوئی پریوں کی کہانی آہستہ آہستہ سُنا رہا ہو۔ دیکھنے
کا انداز کتنا نشیلا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے بنگلے پر تھا۔ خانساماں
نے گھوڑے کی زین اُتار کر رکھی۔ گل خان آتا ہوا دکھائی دیا۔ اُف کتنا
نحیف و کمزور نظر آ رہا تھا۔ میرا دل کسی آنے والے خطرے کو محسوس کر کے
کانپ اُٹھا۔ بابوجی زیبی بھی اپنی ماں کی طرح ڈوب کر مر گئی۔ وہ کیوں۔
میں نے حیران ہو کر کہا۔ میں نہیں جانتا۔ بوڑھا رو رہا تھا۔ محبت کے وہ ایوان
جو میں نے تخیل کی بنیاد پر بنائے تھے اینٹ اینٹ ہو کر بکھر گئے۔ دوسرے دن
مجھے شہباز کے چھوٹے بھائی عزیز نے بتایا جو زیبی کے پڑوس میں رہتا تھا کہ
زیبی کی چاچی نے زیبی کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا۔ بیچاری آپ کے بنگلے
کی طرف گئی۔ اُسے معلوم ہو گیا ہو گا کہ آپ چلے گئے ہیں۔ اُس کی چاچی بھی
کہہ رہی تھی! آخر تجھے چھوڑ کر چلا گیا نہ وہ۔ پھر اُسے گھر سے نکال دیا۔ آپ

کے جانے کے دوسرے دن اُس نے دریائے جہلم میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ آسمان پہ گہرے گہرے بادل آن واحد میں چھا گئے۔ بجلی کسی سوختہ دل کی طرح رہ رہ کر
تڑپ رہی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو چھلک کر زمین پر گر پڑے۔ فضا پر مرگ آفریں سکوت آہستہ آہستہ چھا رہا تھا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا بنگلے کی طرف آ رہا تھا۔ فقط

چیخوف کے خطوط

مترجمہ
وصی صدیقی

گورکی کے نام

ازیالٹا ۳ دسمبر ۱۸۹۸ء

تم نے اپنے افسانوں کے متعلق میری رائے پوچھی ہے تو بھائی میری رائے ہی کیا؟ تمہارے افسانوں کے بارے میں بھلا کوئی کیا رائے دے سکتا ہے۔ تم اپنی مادری زبان کے کامیاب افسانہ نگار ہو تمہارا شائع شدہ افسانہ "اسٹیپ" پڑھ کر میں نے ایک اچھی اور سچے نگار "کاش یہ افسانہ میں نے لکھا ہوتا" تم ایک سمجھدار "آرٹسٹ" ہو۔ جس چیز کو بیان کرتے ہو اس کو خوب اچھی طرح جانتے پہچانتے ہو اس لئے اس کا ہو بہو نقشہ کھینچ دیتے ہو اسی وجہ سے پڑھنے والے اُسے حقیقت سمجھنے لگتے ہیں اور اسی کا نام آرٹ ہے۔ بس اب تو تم کو میری را معلوم ہو گئی ہو گی۔ اور مجھ کو بھی مسرت ہے کہ میں نے تمہارے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔ جو کچھ میں تحریر کر رہا ہوں۔ یہ میرے حقیقی جذبات ہیں۔ اس میں ذرہ برابر بھی تصنع کا لگاؤ نہیں۔ جب کبھی تم کو دو ایک گھنٹہ کے لئے مجھ سے ملنے کا موقع ملے گا تو تم کو حق الیقین ہو جائیگا کہ میں تمہاری کتنی قدر کرتا ہوں۔

اچھا اب ذرا اپنی کمزوریوں کے بارے میں سنو۔ جاننا کہ وہ کوئی آسان بات نہیں۔ ایک غیر زبان کے کامیاب افسانہ نگار کے افسانوں میں غلطیوں اور کمزوریوں کا چننا اتنا ہی مشکل ہے۔ جیسے ایک بڑے سایہ دار پیڑ کی برائیوں کا بیان کرنا، بہت مرتبہ پیڑ کا قصور نہیں ہوتا بلکہ پیڑ اور دیکھنے والے کی پسند کا ہی قصور ہوتا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ خیر۔ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ تم کو مختصر لکھنے کی عادت نہیں۔ تم اپنے افسانے کی منظر نگاری میں ایسا بہک جاتے ہو۔ جیسے تھیٹر میں بیٹھا ہوا تماشائی کسی دلچسپ سین کو دیکھکر اس زوروں سے تالیاں بجانا شروع کر دیتا ہے۔ کہ نہ خود سنتا ہے اور نہ دوسروں کو سننے دیتا ہے۔ یہ کمزوری تمہارے افسانوں میں نمایاں ہے۔ جو تمہارے افسانوں کو شاہکار بنانے میں روڑا اٹکاتی ہے۔ پڑھتے وقت یہی دل چاہتا ہے۔ کاش یہ خیالات مختصر بیان کئے جاتے۔

بار بار مخمل کی سی نرمی، چلتی ہوئی ہوا اور اسی طرح کی دوسری چیزیں پڑھ کر ناظرین کا دل گھبرا اُٹھتا ہے۔ قدرتی مناظر (مثلاً "مالوا" "آن دی ریفٹ") میں اور دوسرے رومانوں میں بھی یہی کمزوری ہے۔ اس کے دوش بدوش ایک ہی الفاظ بار بار تمہارے افسانے میں استعمال ہوئے ہیں۔ بار بار لہروں کا ذکر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے تم تعلیم یافتہ طبقہ میں گھل نہیں پاتے۔ کچھ اُلجھے اُلجھے سے رہتے ہو۔ یہ بات نہیں ہے۔ کہ تم ان کے بارے میں جانتے نہیں، ہو تم ان کو خوب اچھی طرح جانتے ہو پہچانتے ہو۔ لیکن یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم کو ٹھیک سے یہ معلوم نہیں کہ ان کا کونسا حصہ چھوا جائے۔

تمہاری عمر کیا ہے؟ کہاں کے ہو؟ کس شہر میں رہتے ہو؟

میں کچھ نہیں جانتا۔ میں تم سے بالکل ناآشنا ہوں۔ لیکن ایک بات اور کہوں گا۔

تم کو اپنی جوانی کے دو ایک سال "نزینو گرد" میں ادیبوں کے ساتھ گزارنا بہت ضروری ہیں۔ اس لئے نہیں کہ تم اُن کی تقلید کرنے لگو۔ بلکہ اس لئے کہ تم اُن کی صحبت سے فیضیاب ہو۔

ایک بات اور بھی ہے۔ گاؤں میں رہتے رہتے آدمی جلد ضعیف ہونے لگتا ہے۔

نوگردمین۔ گودولیکو۔ پوہوچینکو۔ مارفن۔ آڈیل۔ بہت تنا ندار

ہستیاں ہیں، سپہلے پہل شاید نہیں وہاں رہنا خوشگوار نہ معلوم ہو۔ لیکن آہستہ آہستہ تم ان لوگوں کو وہاں کے ماحول اور خیالات کو سمجھنے لگو گے۔ ان کی اصلی قیمت کو پہچاننا شروع کر دو گے۔ ان کے ساتھ رہتے ہوئے شہری زندگی کی جو خوبیاں اور برائیاں ہیں وہ تمہیں معلوم ہونگی۔

اے ایس شودنگی کے نام

سے لیکھو ۱۳ ۲۳ مارچ ۱۹۵۰ء

...... میں نے تم سے کہا تھا۔ کہ پوہو چھینکو بہت مہذب اور زندہ دل آدمی ہے۔ لیکن اس وقت تم کو یقین نہیں آیا۔ معمولی پتھروں کے بیچ ہی میں بہت سے جواہر بھی پوشیدہ رہتے ہیں۔ جب ہم ساتھی بوڑھے ہو جائیں گے۔ تو یارانہ پیدا کرو۔ پوہو چھینکو ہم سب سے زیادہ ہنسوڑ اور خوش دل ہے۔

اچھا بھائی میں شادی کرنے کو تیار ہوں۔ بس اب خوش ہو لیکن میری شرط بھی سن لو۔ میری زندگی میں کوئی فرق نمایاں نہ ہونے پائے بلکہ میرے تمام کام اسی طرح جاری رہنا چاہییں۔ جیسے چل رہے ہیں۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے۔ کہ میری شریکِ زندگی ماسکو میں رہے، اور میں گاؤں میں گاہے گاہے اُس سے ملنے چلا جایا کروں گا صبح سے شام تک خوش رہنا۔ دن رات خوش رہنا۔ ہر روز خوش رہنا، یہ میرے امکان سے بالاتر ہے۔

میں ایک عورت سے روزانہ ایک ہی طرح کی باتیں سُن کر گھبرا جاؤنگا مثلاً میں ان دنوں سا سے پریشان ہو گیا ہوں۔ اس لئے کہ اس کی تمام حرکتیں، برتاؤ بالکل عورتوں کے سے ہیں، اُسے دیکھ کر مجھے یہ خیال آتا ہے، اگر میں شادی کروں تو میری بیوی بھی ویسی ہوگی۔ حسین، چالاک باتونی وغیرہ وغیرہ۔

ویسے میں اپنی جانب سے یقین دلاتا ہوں۔ میں شوہر کا کردار خوب کامیابی سے ادا کروں گا۔ لیکن مجھے ایسی شریکِ حیات دو جو میری زندگی کے آسمان پر روز مہتاب بن کر نہ نکلے۔

ازدواجی زندگی کے بعد بھی میں ایک کامیاب افسانہ نگار رہ سکوں گا، اس میں مجھے شک ہے۔

اٹلی جا رہے ہو، تو میرا اس سے سلام کہنا۔ مجھے اٹلی سے بہت ہی محبت ہے۔ مجھے یاد ہے، تم نے گردونچ سے شکایت کی تھی، کہ سنٹ مارک ایسی حسین جگہ پر لیٹے ہوئے میں نے کہا تھا اگر اس وقت میں ماسکو کی گھاس پر لیٹا ہوتا تو کتنا لطف آتا۔ لمبارڈی مجھے بہت اچھا لگا۔ وہاں کے ایک ایک درخت مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ جب آنکھیں بند کر کے تصور کرتا ہوں تو تمام وینس میری آنکھوں کے سامنے رقصاں نظر آتا ہے۔

مامن سیو بریک بہت اچھا آدمی ہے اور ساتھ ہی کامیاب ادیب۔ اس کی نئی ناول "روٹی" کی بہت تعریف ہوئی ہے۔ "لیکو" کو یہ ناول بہت پسند آیا ہے۔ مامن کی لکھی ہوئی چند چیزیں تو درحقیقت بہت ہی عمدہ ہیں۔ نچلے طبقے کے لوگوں کی منظر کشی تو وہ ہمیشہ ہی اتنی عمدہ کرتا ہے جتنا "مالک اور نوکر" میں کھینچی گئی ہے۔ تمہارا اُس سے تعارف اور دوستانہ تعلقات ہو گئے ہیں یہ معلوم کر کے مجھے بہت مسرت ہوئی۔

سے لیکھو! میں میرا چوتھا سال ہے۔ میری بگیاں اب گاتے ہو گئی ہیں ننھے ننھے پودے بڑھ کر پیڑ کی شکل اختیار کرنے لگے ہیں۔ اور کبھی یہ بڑے درخت ہو جائیں گے۔ میرے بال بچے لکڑی کی تجارت کریں گے اور مجھے بیوقوف کہیں گے۔ اولاد ماں باپ کے کئے ہوئے کام سے کبھی خوش نہیں ہوتی۔

اس قدر جلد یورپ جا کر کیا کرو گے ابھی وہاں کافی سردی ہوگی۔ مئی تک ٹھہر جاؤ۔ پھر ایک ساتھ چلیں گے۔ خط لکھتے رہا کرو، معلوم نے جنرل کو اکو کیوں واپس بلا لیا ہے۔ کیا جرمنوں کے ساتھ ہماری جنگ شروع ہونے والی ہے۔ اگر جنگ چھڑ گئی تو مجھے لوگوں کے ہاتھ پیر کاٹنے جانا ہوگا۔ اور بعد میں ہسٹریکل منجر ایک تاریخی خطوط نما ماہنامہ میں آپ بیتی لکھنا پڑے گی۔

افسانہ

اُفتادِ طبیعت

مسٹر جبریل کے قلم سے

—— اُس کی ماں سیٹھ چُھنّی لال کے یہاں پیدا ہوئی، پرورش پاکر سِنِ بلوغ کو پہنچی، تمامی اُمورِ خانہ داری اُسے بخوبی سکھلائے گئے۔ اور جب وہ تعلیم پاکر ذی شعور خاتون بن گئی، تو اس کی شادی کلّو سے کرا دی گئی۔!

اس واقعہ کو زمانہ گزر گیا۔ سیٹھ چُھنّی لال ایک باوضع، پُرخلوص، متین اور سنجیدہ انسان تھے۔ اپنے ہمسایہ اور خانہ زادوں سے بیحد خوشگوار تعلقات رکھتے تھے، وہ ایک بڑی جائداد کے مالک تھے، اور گیانی اُن کی آنکھوں کی روشنی گھر کا چراغ اور زندگی کا سرچشمہ تھا۔

گیانی شہر کے کسی انگریزی کالج میں بی۔ اے کلاس میں تعلیم پا رہا تھا، امتحان سے فارغ ہو کر دیوالی کی چُھٹیوں کے موقع پر تیہوار کرنے کی غرض سے وہ اپنے مکان آنے والا تھا۔

ہندوؤں میں دیوالی ایک اہم تیوہار مانا جاتا ہے۔ جس میں تمام دوکاندار اپنی دوکانیں سجاتے ہیں اور اپنے اپنے گھروں میں چراغاں کرتے ہیں۔ جس سے کیا گاؤں، کیا شہر، رشکِ چمنستان بن جاتے ہیں۔

زہے خوش نصیبی۔ چُھنّی لال کے یہاں بیک وقت کئی مسرّتوں کا موقع حاصل ہے۔ ایک تو دیوالی کی خوشی، دوسرے گیانی بابو کا بی۔ اے کا امتحان دیکر مکان واپس آنا، تیسرے گیانی کی شادی کے انتظامات کی مسرّتیں چُھنّی لال کو بیخود و مدہوش کئے دے رہی ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ اولاد کے بالغ ہونے پر والدین کا فرض اوّلین ہوتا ہے کہ وہ اُس کا گھر آباد کریں، اپنی آنکھوں سے نیک قدم بہو کو مکان کی زیب و زینت بنتے دیکھیں۔

چونکہ سیٹھ چُھنّی لال کی عمر بھی کافی ہو چکی تھی، انہیں بہت زیادہ احساس تھا کہ اس فریضہ سے جلد از جلد سبکدوش ہوں۔

مہاراج پُھنیں میں چُھنّی لال بہت بڑے تھے، بیوپاریوں میں بھی گاؤں میں اگر کسی کے یہاں نام آتا تو وہ صرف چُھنّی لال کے یہاں، اور آج یہ وہ نادر تھا جس نے تمام اہلِ خانہ کے چہروں پر مسرّت کی لہر دوڑا دی تھی یعنی (برقیہ) گیانی بابو کا پیام روح افزا آیا تھا۔

تمام گاؤں والے گیانی بابو کو لینے کے لئے اسٹیشن گئے۔

آج سیٹھ جی کا مکان رشکِ جنّت بنا ہوا ہے، در و دیوار پر نُور برس رہا ہے۔ ہر طرف خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں۔

دُنیا میں وہ شخص بہت ہی خوش نصیب ہے، جس کو ایشور نے لچھمی اور اولاد دونوں چیزیں عطا کی ہوں۔ گاؤں والے یکے بعد دیگرے گیانی بابو سے مل رہے ہیں اور مبارکباد پیش کر رہے ہیں۔

آفتاب طلوع ہو کر غروب بھی ہونے لگا۔ مگر سیٹھ جی مسرّتوں میں ڈوبے ہوئے تھے، کہ اُنہیں خبر بھی نہ ہوئی کہ کب صبح ہوئی اور کب شام آگئی۔

اُسی دن سیٹھ جی گیانی بابو کو اپنے ہمراہ تفریح کے لئے باغ اور کھیتوں کی بہار دکھانے لے گئے، عروسِ شب بے نقاب، دیدۂ انجم مصروفِ نظّارہ، گلگونۂ شفق، دلکش فضا، خوشنما منظر، لہلہاتی کھیتیاں، کِھلے ہوئے پھول، سر بند غنچے، زمین پر چاندنی کی نقرئی چادر صہبائے بیخودی پلا رہی تھی۔ باپ اور بیٹے دونوں علیحدہ علیحدہ اپنے جذبات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کس وقت تک ان دونوں پر یہ عالم طاری رہا کیا معلوم؟ ہُو کا عالم ہو گیا، جھینگروں اور گیدڑوں کی آوازیں آنے لگیں۔ دونوں گھر آئے، کھانا کھایا، اور اپنے بستروں پر چلے گئے۔

کالج کے لڑکوں کی عادت زیادہ رات کو سونے کی ہوتی ہے۔ گیانی بھی اُس کا عادی تھا۔ اُس کا اُصول تھا کہ سوتے وقت دودھ پیا کرتا۔ ماما کو خاص ہدایت کر دی گئی۔ چنانچہ اُس نے ملازمہ کو دودھ لانے کے لئے کہا۔ قضا الٰہی سے ماما سو گئی تھی۔

رامیشوری نے اپنی ماں کو جگانا مصلحت کے خلاف سمجھا اور خود کٹورے میں دودھ لیکر چلی۔ لیمپ تیزی سے روشن تھا۔ باہر کھڑکی سے سرد ہوا آ رہی تھی۔ ایک بیس سال کا نوجوان نائٹ سوٹ میں ملبوس محو مطالعہ تھا۔ پاؤں کی آہٹ سے آنکھیں چار ہوئیں۔ اور ۔۔۔ گیانی کے ہوش گم ہو گئے اُس کے ہاتھ سے کتاب گر گئی وہ محو حیرت ششدر رہ گیا۔

خیریت ہو گئی کہ رامیشوری کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دودھ کا کٹورا نہ گرا۔ اُس نے آہستہ سے میز پر رکھ دیا اور نرم آواز میں بولی "پی لیجئے بابو جی"۔

"پی ۔۔۔ ہاں۔ کچھ غیر معنی الفاظ اُس کی زبان سے نکلے دودھ جیسے تیسے پیا اور کٹورا واپس کر دیا۔

رامیشوری چلی گئی ۔۔ لیکن اکیلی نہیں۔ اپنی یاد چھوڑ کر اور کسی کی یاد کے ہمراہ!

گیانی نے لیمپ گل کر دیا۔ کھڑکی کا پٹ بند کر کے سو جانے کی کوششیں ناکام کرتا رہا۔ مگر نیند کہاں۔ رہ رہ کر اُسے رامیشوری کا خیال آتا۔ اُس کا حسین قد، نیم باز آنکھیں، لمبے لمبے بال، گورا رنگ گداز بانہیں، صراحی دار گردن، گلگوں رخسارے، سرخ سرخ ہونٹھ، دلکش چہرہ اور شیریں آواز نے گیانی کے سامنے ایک تصویر خیالی لا کر کھڑی کر دی۔ وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اور تمام رات خیالی تصویر سے باتیں کرتا رہا۔

صبح ہوئی۔ ایک دنیا جاگی اور اپنے اپنے کام میں مصروف ہوئی۔ گیانی بھی بادل ناخواستہ اُٹھا۔ آج اُس کے چہرہ پر رونق نہ تھی۔ جو ہمیشہ رہا کرتی تھی۔ ایک ہی شب میں اُس کا کھلا ہوا چہرہ ٹھٹھر گیا۔ اور صورت تبدیل ہو گئی۔

اب اُس کو صرف ایک ہی خیال تھا۔ ایک ہی جستجو تھی۔ اُس نے رامیشوری سے تنہائی میں ملنے کی بہت کوشش کی۔ اشاروں سے مدعا سمجھایا بھی۔ مگر گاؤں کی اس الھڑ دوشیزہ کی فہم و ادراک سے یہ بات بہت دور تھی۔ وہ نہ سمجھ سکی۔

سیٹھ چھبیلا لال ایک سنجیدہ اور مردم شناس انسان تھے۔ انہوں نے پہلے ہی سے شریمتی کو اشارہ کر دیا تھا۔ کہ رامیشوری کو اُس کے ماما کے کے پاس پہنچا دے مگر دیوالی کی مصروفیتوں کی وجہ سے یہ بات اُن کے ذہن سے اُتر گئی۔ صبح کو ناشتہ کے بعد گیانی اور سیٹھ جی کے درمیان کالج کی زندگی اور شہر کے حالات پر گفتگو ہوتی رہی۔ سیٹھ جی گیانی کو ہمراہ لیکر ایک عزیز کے مکان پر چلے گئے۔ تمام دن گیانی کا بڑی کوفت سے گزرا۔ شام کو وہ اس وقت گھر پر آئے جبکہ رامیشوری اپنے ماما کے یہاں جا رہی تھی۔

بیٹے کو کچھ کھویا کھویا دیکھ کر سیٹھ جی نے دریافت حال کیا۔ تو گیانی نے جواب دیا۔ میرا آج کا دن بڑی مشکل سے گزرا۔ اب میں کسی کے یہاں مہمان نہ جاؤں گا۔ میرا تمام پروگرام خراب ہو گیا مجھے ابھی اسٹیشن جانا ہے۔ میرے پروفیسر کے لڑکے جو میرے ہم جماعت تھے۔ آج شکار کھیلنے گاؤں آ رہے ہیں۔ میں نے انہیں دعوت دی تھی۔ میرا جانا ضروری ہے۔

سیٹھ صاحب نے کہا نوکروں کو بھیج دو۔ تم تھک گئے ہو وہ لے آئیں گے۔ لیکن گیانی کالج کا پڑھا ہوا باپ کو بیوقوف بناتا ہی رہا۔ پتاجی یہ کالج کی تہذیب کے خلاف ہے۔ میرا جانا ضروری ہے۔ وہ بُرا جانیں گے۔"

اب جو سیٹھ جی نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ تمام بیل گاڑیاں جا چکی ہیں۔ صرف ایک رہ گئی ہے۔ اور اس میں بھی رامیشوری جا رہی ہے۔ بڑی تشویش ہوئی۔ آخر یہ طے ہوا۔ کہ اسی گاڑی میں دونوں چلے جائیں۔ رامیشوری تو ماما کے یہاں رک جائے گی۔ گیانی اپنے دوست کو لینے چلے جائیں گے۔

گاڑی میں رضائی رکھ دی گئی۔ دونوں بیٹھ گئے۔ ہانکنے والے نے بیلوں کو ہنٹر رسید کیا۔ گاڑی چلی۔ گاڑی جا رہی تھی اور دو معصوم دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ دونوں طرف جذبات کے بادل اُمڈ رہے تھے۔ اگر گاڑی کے چلنے میں گڑ گڑاہٹ نہ پیدا ہوتی تو دل دھڑکنے کی آواز صاف کانوں سے سنائی دیتی۔ جب گاڑی گاؤں سے بہت دور نکل گئی گیانی

بابو بیقرار ہو کر گانے لگے ۔

نہ جانے کِدھر آج مری ناؤ چلی رے ۔ چلی رے ۔ مری ناؤ چلی رے ۔

اِس جذبات سے لبریز ۔ پُرسوز نغمہ نے رامیشوری کے دل پر بجلی سی گرا دی ۔ اس کی رگیں اس طرح کھنچنے لگیں ۔ گویا وہ بیہوش سی ہوگئی ۔

گیانی بھی محبت کی رَو میں ڈوب گیا ۔ کچھ دیر سکوت کا عالم دو[illegible]ی رہا ۔ اپنے کو سنبھالتے ہوئے گیانی نے مختلف سوالات رامیشوری سے کئے ۔ جن کا اُس نے اطمینان بخش جواب دیا ۔ دُور مندر میں روشنی ہو رہی تھی ۔ رامیشوری نے کہا ۔ میں اس مندر میں کئی مرتبہ گئی ہوں ۔ بڑا اچھا مندر ہے ۔ اگر گاڑی جاتی ہوتی تو بابو ضرور چلتے ۔

گیانی بابو نے بڑے اشتیاق سے پُوچھا ۔ "کیا گاڑی نہیں جاتی ؟"

نہیں پیدل جاتے ہیں ۔ رامیشوری نے جواب دیا ۔ یہی یہی استھان ہے ۔ وہ پگڈنڈی جاتی ہے مندر کی سمت ۔ گیانی نے گاڑی رُکوائی ۔ گاڑی والے کو وہیں چھوڑا اور دونوں دیوی کے مندر کی طرف چل دئیے ۔ رات کا وقت تھا ۔

. . . . ہر طرف مکمل خاموشی ۔ تنہائی اور تاریکی ۔ گیانی کے دل میں طوفانوں کا ایک دریا موجزن تھا ۔ رامیشوری کا کمزور دل بھی نہ معلوم کیوں بڑی سرعت کے ساتھ دھک دھک کر رہا تھا ۔ وہ ابھی مندر سے کافی دُور تھے کہ گیانی بابو نے اپنی باہیں رامیشوری کے گلے میں ڈال دیں ۔ رامیشوری بھی اُن سے ہمکنار ہو گئی ۔ دونوں آدھے راستے سے ہی واپس آ گئے ۔ گاڑی پھر اسٹیشن کی طرف چلی ۔ بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں عجیب انداز میں شور مچا رہی تھیں ۔ ہانکنے والے نے محسوس کیا کہ دونوں خاموش ہیں ۔ اُسے بھی استفسار کی ہمت نہ ہوئی ۔

جبریل

زمزمۂ تغزل

فاروق محشر بدایونی

اشک اُمنڈ آئے دل کو تھام لیا — کِس تکلف سے اُن کا نام لیا

اَور تو کچھ نہیں دمِ رُخصت — اُن کے دامن کو تھام تھام لیا

جب کیا دل نے عزمِ ترکِ وفا — درد نے اُٹھ کے انتقام لیا

اُس کے قدموں پہ میکدے قربان — اُن کے ہاتھوں سے جس نے جام لیا

باغ میں جب کوئی کلی چٹکی — مَیں یہ سمجھا تمہارا نام لیا

داغِ دل تازہ ہو گئے محشر
ہم نے کیوں فصلِ گُل کا نام لیا

شاہپارہ ادب

"معراج"

از انعام کبریائی۔ اے

اس دُنیا سے بہت دُور ایک ستارے میں ایک اور دُنیا ہے۔ جہاں واقعات اِس طرح پیش نہیں آتے۔ جس طرح ہماری دُنیا میں۔

اُس دُنیا میں ایک مرد تھا اور ایک عورت اور دونوں کو ایک جگہ جانا تھا۔ وُہ دونوں بہت دنوں تک ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ چلتے چلتے وہ دوست بن گئے اور یہ ایسی چیز ہے۔ جو اکثر ہماری دُنیا میں بھی پیش آتی ہے۔ لیکن اُس ستارے کی دُنیا میں ایک چیز اور بھی جو اس دُنیا میں نہیں۔ وہاں ایک بہت گھنا جنگل تھا۔ جہاں درخت بالکل ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھیں۔ کرنیں کا سُورج کبھی زمین پہ اپنا اثر نہ کر سکتا تھا۔ وہاں ایک مزار تھا۔ جس پر دن بھر خاموشی طاری رہتی۔ لیکن رات کو جب ستارے چمکنے لگتے اور چاند درختوں کی چوٹیوں پہ چمکتا ہوتا اور زمین پہ سکون محیط ہوتا تو ایسے میں اگر کوئی چھپ کر تن تنہا اس جگہ آجاتا اور مزار کی سیڑھیوں پر جھک کر اپنے سینہ پر ایسا زخم لگاتا کہ خون پتھر کی سیڑھیوں پر گر کر بہنے لگتا تو اُس کی جو بھی خواہش ہوتی وُہ پُوری ہوجاتی تھی اور یہ سب اس لئے ہوتا کہ یہ دُنیا ایک دوسرے ستارے میں ہے جہاں واقعات اِس طرح پیش نہیں آتے جس طرح ہماری دُنیا میں۔

وُہ مرد اور عورت ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور اس عورت کو اُس مرد سے لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ لگاؤ ہماری زبان کا اور ہماری دُنیا کا لفظ ہے۔ اُس دُنیا میں اِس بات کو اس طرح کہا جاتا ہے کہ وُہ عورت اس مرد کی بھلائی چاہتی تھی۔

ایک رات کو جب چاند نکل رہا تھا اور درختوں کے پتوں پہ چاندنی پھیل رہی تھی اور سمندر کی لہریں چاندی کے رنگ کی ہو رہی تھیں تو وہ عورت اُس جنگل کی طرف جارہی تھی۔ جنگل میں اندھیرا تھا۔ کہیں کہیں اس کے پاؤں کے گرد جھائی ہوئی پتیوں پہ چاند کی کرنیں پڑ رہی تھیں۔ شاخیں اس کے سر پہ ایک دوسرے سے مل رہی تھیں اور عشق پیچاں کی گنجان بیلیں درختوں سے لپٹی ہوئی تھیں۔ آگے چل کر اندھیرا اور زیادہ ہوگیا۔ ایک کرن بھی چاند کی دکھائی نہ دیتی تھی۔ وُہ مزار کے قریب پہنچ گئی اور اُس نے جُھک کر دُعا مانگنی شروع کی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اُس نے ایک نوکدار پتھر اُٹھایا اور اپنے سینے پر زور سے دے مارا۔ ایک بار دو بار اب زخم سے خون کے قطرے سیڑھیوں پر ٹپک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد جب خون بہنے لگا تو ایک آواز آئی۔

"تمہاری قربانی قبول کی جاتی ہے۔ مانگو کیا مانگتی ہو؟"

اُس نے ہمت کر کے کہا میں ایک مرد کو دُنیا کی سب چیزوں سے زیادہ چاہتی ہوں۔ میری تمنا ہے کہ اُس پہ رحمت اور برکت کے دروازے کھل جائیں اور اس کے حق میں میری بہترین دُعا قبول ہوجائے۔

سوال ہوا۔ "وُہ دعا کیا ہے؟"

اُس نے کہا "یہ تو میں نہیں جانتی کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ لیکن اس کے حق میں جو بات سب سے زیادہ مفید ہو وہ اُسے حاصل ہوجائے یہ میری تمنا ہے اور مجھے کچھ خبر نہیں"۔

جواب ملا "تمہاری دعا قبول کی جاتی ہے۔ اُسے سب سے زیادہ مفید شئے مل جائیگی"۔

یہ سُن کر وہ کھڑی ہوگئی۔ اُس نے اپنا سینہ ڈھک لیا اپنے ہاتھوں سے زخم کو مضبوطی سے دبا لیا اور جنگل سے باہر بھاگ گئی۔ مُردہ پتیاں اُس کے پاؤں تلے کھڑکھڑانے لگیں۔

چاندنی پھیل رہی تھی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے ساحل پہ ریت کے ذرات چمک رہے تھے وہ ہموار سطح پر دوڑ رہی تھی۔ اچانک وُہ رُک گئی اور پتھر کی طرح ساکت رہ گئی۔ دُور پانی پر کوئی چیز چلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنی پلکوں

کو دو ایک بار جھپکا اور پھر آنکھیں کھول کر چاروں طرف نظر دوڑائی ایک کشتی جا رہی تھی اور دُور تک پانی پر چاندنی پھیلی ہوئی تھی کشتی میں ایک مرد کھڑا ہُوا تھا اس کا چہرہ اگرچہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر وہ اُسے جانتی تھی اور اب پہچان گئی تھی کشتی بہت تیز جا رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا کوئی پتوار ہی نہیں چلا رہا ہے۔ لہروں پر چاند کی مدھم روشنی نے اُسے صاف طور پہ دیکھنے نہ دیا۔ کشتی دُور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن شاید اس میں کوئی اور بھی بیٹھا تھا کشتی اب بہت دُور جا چکی تھی۔ وہ ساحل کی طرف بھاگی۔ مگر قریب نہ جا سکی اس کے کپڑے تیز ہوا سے اُڑ رہے تھے اُس نے اپنے بازو پھیلا دئے اور چاند کی روشنی اس کی لمبی لمبی زلفوں سے کھیلنے لگی۔ پھر کہیں سے آواز آئی "اب کیا چاہتی ہے"؟

اُس نے جذبات کو دباتے ہوئے عجیب دردمند انداز میں کہا "اے آواز کے سننے والے! میں نے اپنے خون سے اس کی بھلائی خریدی ہے۔ میں اُسے یہی دینے آئی تھی۔ مگر کیا قیامت ہے۔ کہ وہ مجھ سے دُور ہوا جا رہا ہے"۔

سرگوشی کے لہجہ میں کسی نے کہا "تمہاری دعا قبول ہو چکی ہے اُسے سب سے زیادہ مفید شئے مل گئی ہے"۔

اُس نے بےصبری سے پوچھا "وہ کیا ہے"؟

ندا آئی "تم سے جُدائی، تم سے دُوری ـــ وہ یہ ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ کر تم سے دُور چلا جائے"۔

وہ بے حس و حرکت کھڑی رہی سمندر کی سطح پر اب کشتی نظر نہ آ رہی تھی۔ چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔

بہت آہستگی اور نرمی سے آواز آئی "کیا تم مطمئن ہو؟"

اور اُس عورت نے کہا "اے آواز دینے والے! ہاں! اب میں مطمئن ہوں"۔ اُس کے پاؤں پر لہروں کے ٹکرانے سے بلبلے جلد جلد بن کر ٹوٹ رہے تھے۔ مگر اب وہ مطمئن تھی۔

(مرکزی خیال

کا ہے)

غزل

بہلتا نہیں دل مرا اس چمن میں
ہجوم گل و لالہ و یاسمن میں

محبت کی یہ منزل آدلیں ہے
کہ خلوت ہے حاصل مجھے انجمن میں

حجاب نظر یہ مری بیخودی ہے
وگرنہ وہ آباد ہیں میرے من میں

کھلیں مجھ پہ کیا غنچگی کی ادائیں
کہ بیگانۂ گل ہوں اپنے چمن میں

جھلکتی ہے آنکھوں سے دل کی تمنا
کمی کوئی باقی ہے اپنی لگن میں

مزا دے گئی مجھ کو غم کی درازی
میں غربت میں ہوں اور ہے دل وطن میں

جھلک صبح نو کی ہے پیدا غزل میں
جو شبنم کی سہمی ہوئی سی کرن میں

ثاقب سلمانی

پارک

از
اکالی گربچن سنگھ

مدت گزر گئی۔ اس سے پہلے لوگوں نے وہاں جھاڑ جھنکاڑ یا کچھ بے کار پودے، اور کوڑا کرکٹ جو کان گڑھوں کو پُر کرنے کے لئے گرایا جاتا تھا سوائے اس کے اور کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اور اب گڑھے بھر چکے تھے۔ وہ ناہموار قطع زمین اونچی نیچی سطحوں کا ایک ملبہ سا نظر آتا تھا ...... جہاں ہر موسم میں کچھ رنگ برنگے لہلہاتے پھول لہراتے نظر آتے تھے۔ کچھ زہریلے کیڑے مکوڑے اور جانور جیسے سانپ اور بچھو ان سب کا وہاں بسیرا تھا اکثر کچھ غریب گھروں کی چھوکریاں اور چھوکرے دن بھر وہاں زنگ آلود لوہے کے ٹکڑے، ٹین اور اس کے علاوہ لکڑی اور کچھ کوئلوں کی کھوج میں سرگرداں نظر آتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ جانور جیسے دھوبی کے گدھے آوارہ کتے، ہری ہری گھاس اور سڑے گلے گوشت کی خاطر ادھر اُدھر مُنہ مارتے نظر آتے تھے بعض اوقات جبکہ کوئی مرا ہوا جانور وہاں لا کر پھینکا جاتا۔۔ گدھوں اور چیلوں کا ایک بڑا جمگھٹ آسمان پر منڈلاتا نظر آتا تھا۔

صبح کے وقت اس جگہ شہر کا کوڑا لانے والے مہتروں اور مہترانیوں کا ہجوم رہتا۔۔۔۔ کچھ مہتروں کے منچلے لونڈے گدھوں پر چڑھے بھانت بھانت کی بولیاں بولتے، کچھ گندے گیت گاتے۔ نوجوان لڑکیوں سے ٹھٹھا مخول کرتے دیکھے جاتے تھے۔ اور شام کے وقت ایک بیکراں اُداسی اور سناٹا ۔۔۔۔ جیسے سارا ماحول ایک کھنڈر بن گیا ہو۔ ایک ناقابل برداشت بُو جو کہ اس جگہ فضا کو متعفن کئے رکھتی تھی۔ رات کے وقت دُور دُور تک خوش آفریں فضا کو گندہ اور آس پاس کے علاقوں کو دوزخ کا گھر بنا دیتی تھی۔

اسی طرح مدت سے دھرتی کا وہ زخم یعنی وہ گڑھے، شہر کے کوڑا کرکٹ، مٹی، گندگی گویا ہر طرح کے مسالے سے بھرتے چلے آ رہے تھے۔ اور آج اونچی نیچی ناہموار سطح زمین کے سوا وہاں اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اب یہاں کچھ مویشی بھی چرنے چلے جاتے تھے۔ اب کچھ دنوں سے اُس ناہموار زمین کو ہموار کیا جانے لگا تھا۔ ہموار کرنے سے پہلے اُسے صاف کر لینا ضروری تھا۔

اب لوگوں نے دیکھا تھا مزدوروں اور مزدورنیوں کی ایک کثیر تعداد اپنے سروں پر بوجھ اُٹھائے اُس زمین کو تراشنے اور ہموار کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ اُن دنوں سینکڑوں کی تعداد میں مزدور اور مزدورنیاں یہاں کام کرتی نظر آتی تھیں۔ صبح ہوتے ہی وہ اپنے اپنے کاموں پر پہنچ جاتے تھے۔ وہاں ایک میلا سا لگ جاتا تھا، وہ ایک مربع میل زمین ..... اس پر دن بھر پھاوڑے چلتے، گندی زمین کی چھاتی پر زخم لگاتے ۔۔۔۔ اور مزدورنیاں اپنے اپنے سروں پر بوجھ اُٹھائے اِدھر اُدھر چلتی پھرتی نظر آتی تھیں۔

پسینے سے شرابور ان کے چہرے ۔۔۔۔ سرخ آنکھیں چلچلاتی ہوئی دھوپ۔ لُو کی لپٹ میں کچھ ہانپتی اور لمبے لمبے سانس لیتی ہوئیں وہ بڑی محنت اور جفاکشی سے اپنے کام میں مشغول رہا کرتی تھیں اُن کے رنگ روپ بھی عجیب تھے۔ کوئی کالا کوئی گورا، کوئی ان میں ادھیڑ عمر، کوئی نوجوان، کوئی بچہ کوئی کمزور، کوئی تگڑا اور کوئی بیمار۔ الغرض ہر قسم کے مزدور یہاں دیکھے جاتے تھے۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں سے مخول کرتے۔ بوڑھے نوجوانوں کو چھیڑتے اور ہدایت کار منشی ان کو گالیاں دیتے اور کام پر مشغول رہنے کا حکم دیتے رہتے تھے۔

کام زوروں پر تھا۔ اس کام کو دیکھ کر پھر غریب مزدوروں کی حاجت کو مدنظر رکھ کر اس گندی اور متعفن جگہ کے آس پاس کچھ پان بیڑی اور چنا چبینا بیچنے والوں نے چھوٹی چھوٹی جھابڑیاں لگانی شروع کر دی تھیں۔ کام بڑی تیزی سے ختم کیا جا رہا تھا۔ ٹھیکے کے

بُرست مالک نے ایک کثیر رقم وقت مقررہ پر ختم کرنے کے لئے پہلے ہی سنبھال لی تھی ..... اور پھر چھوٹے چھوٹے ٹھیکیداروں نے آپس میں مل کر یہ سارا کام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ اس نے نفع کمانے کے لئے مزدوروں کو ستائے اور اُن سے زیادہ کام لینا شروع کر دیا تھا۔ کچھ بابو اور قلیوں کے منشی سارا دن چیخ چیخ کر گالی گلوچ اور دھمکیوں سے غریب مزدوروں سے کام لینے کی سعی کرتے تھے۔ اب وہاں حبشیوں کے بچے، کمہاروں کے گدھے، منڈلاتی ہوئی چیلیں یہ سب کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

ان دنوں مزدوروں کے ناک میں دم تھا۔ اُن سے وقت مقررہ سے زیادہ کام لیا جاتا تھا ذرا ذرا سی بات پر نوکری سے علیحدہ کر دینے کی دھمکی دی جاتی تھی۔ وہ میٹ جو کہ منشی کہلاتے تھے۔ مزدوروں کے نام پر گریکار رہتے اور انہیں زیادہ کام کرنے پر طرح طرح کے لالچ دیتے رہتے تھے۔ ان دنوں لوگوں میں عجیب عجیب چرچے تھے اور یہ بات تو عام لوگوں میں مشہور ہو چکی تھی کہ یہاں ایک بہت بڑا پارک بننے والا ہے۔ لوگوں کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ اپنے شہر میں جس چیز کی کمی محسوس کر رہے تھے۔ وہ جلد پوری ہونے والی تھی۔ لوگ ان دنوں اکثر شام کے وقت ٹہلتے ٹہلتے یہ نظارہ دیکھنے اُدھر نکل جاتے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے زمین بہت جلد ہموار کی جا رہی ہے راستے ہر طرح کی غلاظت سے پاک کیا جا رہا ہے۔ شہر کے باہر سے مٹی لا لا کر اسے اور بھی زیادہ زرخیز بنایا جا رہا ہے۔

لوگوں کے ذہن میں پارک کے عجیب و غریب نقشے تعمیر ہو رہے تھے جنہوں نے کبھی کوئی پارک نہیں دیکھا تھا اُن کے ذہن میں ہر طرح کی دلفریبی۔ جاذبیت۔ دلکشی۔ الغرض ہر ایک کی دلچسپی کا سامان یہاں موجود نظر آتا تھا۔ وہ کچھ کا کچھ سمجھ رہے تھے۔ لیکن اس قطعۂ زمین کو درست ہونے میں ابھی کافی وقت کی ضرورت تھی ..... !

اُن دنوں لوگوں کے دلوں میں یہ بھی خیال اُٹھا کہ اس پارک کا نام کیا ہوگا۔ لوگ ان نے بڑے بڑے نام سُن رکھے تھے۔ طرح طرح کے باغوں کی تعریفیں بھی سُنی تھیں اور اب وہ سوچ رہے تھے۔ اس پارک کا نام شہر کی ایک بڑی فرم کے انگریز مالک کے نام پر "کیننگ گارڈن" پڑے گا ..... اور یا نہیں تو اُس ٹھیکیدار کے نام پر جس نے شہر میں ایک یتیم خانہ کھول رکھا ہے "عبادت پارک" رکھا جائیگا اس کے علاوہ اور بھی بہت سے نام تھے ..... عام لوگوں کا خیال تھا کہ یہ جگہ ایک ایسے انسان کے نام پر موسوم کی جائیگی۔ جو کہ سارے شہر میں اپنی فراخدلی کے لئے مشہور ہے۔ جس کے کئی ہوٹل چلتے ہیں۔ کئی گوشت کی دُکانیں ہیں۔ آئے دن بڑے بڑے سرکاری افسروں کو پارٹیوں اور جلسوں میں مدعو کئے رکھتا ہے۔ ایک دفعہ ایک الیکشن میں اپنے ایک دوست کی خاطر اُس نے دل کھول کر دھن لٹایا تھا۔ شہر کا بڑا کافی ہاؤس اور ناچ گھر انہیں کے دم خم سے قائم ہے۔ عورتوں کو تتلی سمجھتا تھا۔ جن کے پر نازک اور ملائم ہوتے ہیں۔ ہاتھ لگاتے ہی جھڑ جاتے ہیں۔ بس ایسے ہی شخص کا نام پارک کے لئے انتخاب ہونے کی توقع تھی۔ اس کے علاوہ ایک لیڈر جو کہ ہمیشہ مزدوروں کی حامی بھرا کرتا تھا۔ بڑے بڑے اسٹیجوں پر کھڑے ہو کر لاکھوں کی تعداد میں اکٹھے ہوئے سامعین کے سامنے اُن کے دُکھڑے روتا۔ اُن کی ناگوار اور خشک زندگی کا نقشہ کھینچ کر اُن کے دُکھوں کا ذکر کرتا۔ پھر مل کے مالکوں کو دھمکی دیتا۔ سرمایہ داروں کو گالیاں دیتا۔ وہ مزدوروں کے پست حوصلوں کو بڑھانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ کچھ دن بیتے بیچارہ ایک مل کے سٹرائک کے موقع پر گولی کا نشانہ بنا دیا گیا تھا۔ کچھ بھولے مزدوروں کا خیال تھا۔ کہ وہ پارک اُن کے اس پوتر دیوتا کی یادگار میں بنایا جا رہا ہے۔ اور کچھ مزدور اُس میدان میں اُسی جذبہ کے ماتحت خوب حوصلے سے کام کر رہے تھے۔ جُوں جُوں وقت گزرتا جا رہا تھا۔ لوگوں کا اپنا اپنا قیاس اور بھی مستحکم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ انہی دنوں تقریباً شہر کے ہر حصّہ میں اس بات پر لاٹھے زنی ہونے لگی تھی۔ انہی باتوں کو لیکر چند ایک ایسے آدمیوں نے جو کہ وقت سے فائدہ اُٹھانا جانتے تھے شہر میں فساد کھڑا کر دیا۔ نتیجہ کے طور پر ایک دو آدمی مارے گئے۔ چند زخمی ہوئے اور کچھ دنوں کے لئے میدان کا کام روک دیا گیا۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ شہر کے قریب ہی کی ایک ریاست کے ایک بڑے صاحب اپنی میم صاحبہ کے ساتھ ایک تقریب

میں تشریف لائیے۔ کچھ دن ٹھہرے میم صاحبہ نے شہر کے بڑے بڑے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سُنا تھا بڑی ملنسار ہیں۔ جتنے دن رہیں اُجڑے دلوں میں بہار چھائی رہی اور جب چلی گئیں۔ دلوں پر زخم لگا کر درد چھوڑتی گئیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر یکایک انہی دنوں وہ میدان پھر بننا شروع ہو گیا اس دفعہ پارک کا نام میم صاحبہ کے نام پر موسوم ہو چکا تھا اب سینکڑوں کی تعداد میں پھر مزدوروں کی ایک کثیر تعداد وہاں جمع ہو جایا کرتی تھی پھاوڑے چلتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ایک عجیب دلسوز ہنگامے کے ساتھ وہ زمین صاف و ہموار ہوتی نظر آتی تھی۔ کوڑے کرکٹ کی وہ دُنیا جہاں سوائے غلاظت کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ آج زرخیز میدان کی صورت میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُن دنوں مزدوروں کو دوسرے دن کی نوکری کی فکر نہیں تھی انہیں پتہ تھا۔ یہ کام ابھی مہینوں ختم ہونے کا نہیں اور جب تک دریا کے کنارے سے پانچ پانچ فٹ مٹی لا کر اسے اور بھی اُونچا نہ کیا گیا کام بند نہیں ہو گا۔

دن بیتتے چلے جا رہے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میم صاحب کے نام کا ایک بورڈ تیار ہونے والے باغ کے ایک گوشے میں لگ چکا تھا روزانہ موٹر لاریاں ندی کنارے سے مٹی لا لا کر وہاں ڈھیر لگاتی جا رہی تھیں۔ زمین کو عین سطح پر لانے کے لیے انجینئر ایک آلہ کی مدد سے ہمیشہ کچھ ناپتے اور میدان کے حصّہ کو کچھ بڑھاتے اور گھٹاتے نظر آتے تھے اور جب مٹی کی تہ اچھی طرح زمین میں دبائی جا چکی! ایک دن اُس ادھورے پارک کے کنارے اور آس پاس رہنے والے باشندوں کو اپنی اپنی جھونپڑیاں ہٹا لینے کا حکم مِل گیا۔ کیونکہ وہ پارک شہر کے شوقین مزاج لوگوں کی دلچسپی اور خوبصورتی کو مدِ نظر رکھ کر بنایا گیا تھا اور اب وہاں ان فرسودہ اور گندے مناظر کو دیکھنا ٹھیک نہیں تھا۔

اُس میدان میں درجنوں قسم کے بیل بوٹے لگائے گئے اور طرح طرح کے درخت پھل دار چھاؤں والے دیکھنے میں نظر افروز۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رنگین اور خوشنما نئے نئے پھولوں کے پودوں سے کیاریاں سجائی گئیں۔ مرمریں حوض بنائے گئے۔ جن میں رنگ برنگی قیمتی مچھلیاں چھوڑی گئیں اور اسی طرح دو بڑے بڑے حوض بنائے گئے۔ ایک عالیشان ہال جس کے ساتھ متعدد کمرے تھے۔ کلب گھر کے لئے تیار ہوا۔ لوگ خیال کرتے تھے کہ بڑے بڑے لوگ بحث و مباحثہ کیا کریں گے بعض موقعوں پر پارٹیاں ہوا کریں گی اور شوقین مزاج اصحاب کبھی ناچا کریں گے کبھی تماشہ کیا کریں گے اور کبھی جُوا و شراب سے اپنا من بہلایا کریں گے۔

جب چھوٹے چھوٹے پودے پروان چڑھنے لگے۔ پارک کے کلب بن کر تیار ہو گئے۔ پارک کے اِرد گرد ایک جالی نما فصیل تیار کر دی گئی اور تب مزدوروں کو چھٹی دے دی گئی۔ اب وہاں صرف چند مالی اور چند چپڑاسی ہی رہ گئے تھے مالی اُن پودوں کی حفاظت کرتے اور چپڑاسی رکھوالی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد پارک مکمل طور پر بن کر تیار ہو گیا شہر کے بڑے بڑے لوگوں نے راجہ صاحب کی اُس نوجوان میم کو ایک بڑے جلسے میں دعوت دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اُس دن پارک کو رنگ برنگ کے بجلی کے قمقموں سے سجایا گیا۔ طرح طرح کے دلکش واندنات سے آراستہ کیا گیا۔ ۔ ۔ ۔ کہیں بینڈ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کہیں اس سے بھی زیادہ دلکش ساز بج رہے تھے۔ اُس دن پارک شہر کے بڑے بڑے رئیسوں کی آمد سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کلب گھر شوقین مزاج نوجوان لڑکیوں، مردوں اور عورتوں سے بھرپور تھا۔ میم صاحبہ نے ایک ولولہ انگیز تقریر کی۔ "اُسے شہر کے باشندوں سے ہمدردی ہے۔ وہ بہت جلد لڑکیوں کے لئے ایک کالج کھولیں گی اور بچّوں کے لئے ایک چھوٹا سا کلب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اُس تقریر پر لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں اور مبارکباد کے نعرے لگائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پبلک اب اُس پارک میں سیر و تفریح کے لئے عموماً آیا جایا کرتی تھی۔ شام ہوتے ہی وہاں ایک میلہ سا لگ جاتا تھا۔ ہجوم میں طرح طرح کے لوگ نظر آتے تھے۔ کہیں عاشق، کہیں معشوق، کہیں غنڈے، کہیں بدمعاش۔ ۔ ۔

سفید پوش، کہیں فیشن ایبل۔ ہر خیال اور ہر مذاق کے لوگ باغ کے خوشنما پیڑ پودوں کے پاس چلتے پھرتے ...... پھولوں سے لدے دلبہار پودے اپنی خوشبو لٹانے میں مست نظر آتے تھے۔ وہ ایک عجیب دُنیا تھی۔ شہری زندگی اور اس کے کاروباری ماحول سے اُکتائے لوگ۔ دل جلے اور دل کو لٹائے ہوئے لوگ سب وہاں آتے اور شام کی اُبھرتی ہوئی تاریکیوں میں ہوش و مستی کو لٹاتے اور اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ اب وہاں کچھ دنوں پہلے کی سی ویرانی یا زمین پر کوڑے کرکٹ کا ڈھیر نہیں تھا۔ نہ سانپ تھے نہ بچھو اور نہ ہی گیدڑ گھستے اور گدھے اب کبھی وہاں غریب بچے کوئلے اور لکڑی کے ٹکڑے چُنتے نظر نہیں آسکتے تھے۔ وہ پارک ایک عجیب دلکشی کا مرکز بن گیا تھا کہ لوگ گویا اسی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔

ایک مدت گزر جانے کے بعد...... ایک رات کے وقت...... غالباً جبکہ آدھی رات بیت چکی تھی، ایک لڑکی روتی ہوئی پارک کے بڑے پھاٹک کے قریب آکر رُکی۔ ایک ہاتھ میں اُس نے لکڑی تھام رکھی تھی، لکڑی کے دوسرے سرے کو ایک اندھے نے پکڑ کر راہ کی ٹھوکروں سے بچنے کے لئے سہارا لے رکھا تھا۔ لڑکی ...... جو شاید اس اندھے بوڑھے سے تنگ آچکی تھی۔ دانت کچکچاتی ہوئی بولی "یہاں بھی پھاٹک بند ہے"۔ "کیا پھاٹک بند ہے"؟ گویا بوڑھے کو تعجب ہوا "آدھی رات کے وقت مندر، مسجد، گوردوارے اور دھرم شالے، کیا ان سبھوں کے پھاٹک بند ہو جاتے ہیں بیٹی!

...... لیکن بیٹی...... یہ تو پارک ہے...... میں نے ایک زمانہ میں جبکہ یہ پھاٹک تیار کیا گیا تھا، یہاں نوکری کی تھی۔ اس وقت میں نے لوگوں کی زبانی سُنا تھا کہ یہ عام لوگوں کے سیر و تفریح و آرام کرنے کی جگہ ہے، اس کا پھاٹک کھُلا ہوگا، ذرا غور سے دیکھو"۔ "میں کہہ رہی ہوں کہ پھاٹک بند ہے"۔ وہ اسی طرح چبا چبا کر بولی۔ بوڑھا اندھا بولا "پھاٹک بند ہے تو اب کہاں آرام کریں بیٹی؟ مزدوری کرنے کی سکت نہیں۔ پاس پیسہ نہیں۔ جو پیسے ہوتے تو شہر کے کنارے کہیں کوئی جھونپڑا بنا کر سر چھپا لیتے ...... یہ پارک تو سُنا تھا بیٹی لوگوں کے آرام کی خاطر بنایا گیا ہے۔ ذرا چپراسی کو آواز دے دروازہ کھول دیگا ...... یہ پبلک کی جگہ ہے"۔ "دادا ...... !" "کیا میری بیٹی ...... ؟" "ہاں وہ چپراسی ......" "کیا کہہ رہا ہے میری بیٹی ...... ؟" "وہ مجھے اشارے سے اپنی طرف بُلا رہا ہے"۔ "چلو مجھے بھی ساتھ لے چلو میں بھی چلتا ہوں ...... وہ ہمیں آسرا دینا چاہتا ہے، میں نہ کہتا تھا کہ یہ پبلک کی جگہ ہے"۔ دونوں آگے بڑھے جونہی پھاٹک کے اور قریب پہنچے چپراسی للکار کر بولا "خبردار، کون ہو تم"؟ دونوں وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔ "دادا ...... !" "کیا ہوا بیٹی ......" "وہ تو مجھے اکیلی کو اشارے سے اپنی طرف بُلا رہا ہے ...... !" "کیا کہا ...... ؟" "ہاں چلو ...... وہ مجھے کہتا ہے ادھر آؤ"۔ "وہ تجھے اکیلی کو کہتا ہے ...... " "ہاں دادا ...... !" "ہیں! یہ تو پبلک کی جگہ ہے ...... اور یہ ...... بدمعاش ...... تجھے کیا کہتا ہے بیٹی ...... چھی چھی چھی! چلو بیٹی ہم لوٹ چلیں کسی دیوار کے سایہ میں سو رہیں گے۔ یہ چپراسی پاجی معلوم ہوتا ہے، پبلک کی جگہ میں یہ حوصلہ ...... !"

اکالی گربچن سنگھ

غزل

عنبر چغتائی

اے غم نصیب دِل! تجھے آتا نہیں یقیں؟
تیرے لئے جہاں میں ہے سب کچھ، وہی نہیں

طے کر گیا ہُوں کتنے جہاں ایک گام میں
یاد آگئی ہے دوست کی جب ہم وہی کہیں

شبنم سے اور نکھرا ہے حُسنِ شگفتِ گُل
چھلکے جو اشک ہوگئے وہ اور بھی حسیں

جب پُوچھتا ہُوں "کیا نہیں آتی کسی کی یاد"
اُن کے بجائے دِل مرا کہتا ہے "جی نہیں"!

ڈر ہے کہ آتے آتے کہیں دیر نہ ہو جائے
ہے تیری راہ میں غمِ دُنیا کہیں کہیں

پھر بھی اسیر ہُوں میں طلسمِ وجُود میں
اپنا پتہ نہیں ہے تمہاری خبر نہیں

تلخی یہ آگئی ہے مزاجِ نیاز میں
تیرے حضور بھی نہ جھُکے شاداب جبیں

کا اجراء

کیا جا رہا ہے۔ پنجاب میں مسلمانوں کا کاغذ و گتہ سازی کا کوئی کارخانہ نہیں ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر بیس لاکھ روپیہ کے سرمایہ سے لاہور پیپر ملز کے نام سے ایک لمیٹڈ کمپنی کا اجرا ہو رہا ہے پنجاب کے مشہور تاجر شیخ عبدالمالک آف مالکو شو کمپنی لمیٹڈ (مالک کرنال شاپ لاہور) اس کاروبار کی بنیادیں استوار کر رہے ہیں۔ جس سے یقین واثق ہے کہ لاہور پیپر ملز تجارتی و صنعتی لحاظ سے ایک کامیاب ادارہ ثابت ہوگا۔

ایسے ذی ثروت اصحاب جو ڈائرکٹریٹ میں حصہ لینا چاہتے ہوں یا جو اصحاب اپنا سرمایہ کسی منفعت بخش کاروبار میں لگانا چاہتے ہوں وہ پتہ ذیل پر خط و کتابت کریں۔

جو لوگ کاغذ کی تجارت سے دلچسپی رکھتے ہوں وُہ ہم سے رجوع کریں۔

ارشد رشید منیجر مالکو شو کمپنی

حاجی بلڈنگ آبکاری روڈ لاہور

افسانہ

سیاسی جنون

از: مس الفت منہاس بی اے بی ٹی

سجاد دفتر سے لوٹا تو بہت تھکا ہوا تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اس کا سانس اور پھول گیا۔ کمرے میں پہنچتے ہی آرام کرسی پر اُس کی للچائی ہوئی نظریں پڑیں۔ اور وہ کینوس میں تقریباً دھنس سا گیا۔ چند منٹ یونہی بے سُدھ لیٹے رہنے کے بعد اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ گھر کا چھوٹا سا ملازم دروازہ میں حکم کا منتظر کھڑا تھا۔ سجاد نے اپنے بوٹوں کی طرف دیکھا وہ گدلے رنگ کی مٹی سے اَٹے پڑے تھے۔ ان کا براؤن رنگ مٹیالے رنگ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اور اس کی سفید زین کی پتلون کے کنارے بھی بوٹوں سے میچ ہو رہے تھے۔ جیسے کسی نے سفید پائچوں پر مٹیلے رنگ کا بوڈر لگا دیا ہو۔۔۔

اس کے اس طرح دیکھنے کو ملازم سمجھ گیا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا اور بوٹ کے تسمے کھولنے شروع کر دئے۔ سجاد سیدھا ہو کر بیٹھنے کے لئے آگے کو ہوا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کی پسینے سے تر قمیص کرسی سے چپک گئی ہے اُسے اپنے آپ سے گھن سی آنے لگی۔ اُس نے جھٹکے کے ساتھ اپنے آپ کو اس سے علیحدہ کیا۔۔۔ اُس کی زندگی بھی کیا ہے۔ اُس نے سوچا صبح سے شام تک دفتر میں ہندسوں کو آگے سے پیچھے اور دائیں سے بائیں ناچتے دیکھتے رہنا۔ جیسے بونوں کا ایک بے ہنگم سا ناچ۔۔۔ اور پھر شام کو چار بجے جب وہ کرسی سے اٹھتا۔ تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سارا جسم حتیٰ کہ دماغ بھی ایتھر کلورائڈ سے سن کر دیا گیا ہے۔ اس میں سمجھنے تک کی قوت بھی ختم ہو چکی ہوتی۔ وہ نہ کسی سے بات کرتا اور نہ راستہ میں کہیں ٹھیرتا اگر کبھی کبھار اُسے کوئی دوست مل جاتا تو وہ ہوں ہاں میں ساری باتیں ٹال جایا کرتا۔ اور اب تو اس کے واقف کار اس کی عادت کو جان گئے تھے۔ اس لئے جب وہ دفتر سے لوٹ رہا ہوتا تو اسے کوئی نہ بلاتا کیونکہ انہوں نے اکثر اسے کہتے سنا تھا۔ اِس وقت اِس قدر تھک گیا ہوں۔ کہ بولنے کی سکت نہیں اس کے بعد کوئی دوست بھی دلیل پیش کر کے بحث میں کیسے پڑ سکتا تھا۔ جب یہ جانتا تھا کہ دوسرا فریق سرے سے جواب دینے سے ہی انکار کرے۔۔۔

اس نے اپنے جلتے ہوئے پاؤں کی طرف دیکھا اور نئے نئے دُھلے ہوئے فرش کو بھی دیکھا۔ صاف صاف سرخ گیلی اینٹوں نے اسے مجبور کر دیا اور اس نے اپنے پاؤں فرش پر رکھ دئے ٹھنڈ اس کے پاؤں کے راستہ سے چڑھتی ہوئی اس کے جسم کی تمام نسوں میں سرایت کر گئی چند لمحوں کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اور نوکر کو کھانے کا کہہ کر وہ خود کپڑے تبدیل کرنے کو چلا گیا۔

نلکے کے نیم گرم پانی سے منہ ہاتھ دھو کر اور ساتھ ہی کارپوریشن والوں کو صلواتیں سنا کر وہ کرسی پر آ بیٹھا۔ اس کے سامنے چھوٹی سی میز پر مختصر سا کھانا رکھا تھا۔ جو اسی نوکر کا پکایا ہوا تھا۔ اُس نے میلا سا رومال اٹھا کر دوسری طرف رکھ دیا۔ اور اپنے سامنے دال دیکھ کر اس کا دل جل گیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ پلیٹ کو نوکر کے منہ پر دے مارے۔

"یہ کیا ہے"؟ اس نے ماتھے پر تیوریاں ڈالتے ہوئے نوکر سے پوچھا۔

"دال"

"یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن یہ یہاں کیوں ہے۔ دنیا کے کیا سب بکرے اگلے جہان کو سدھار گئے ہیں جو آج اس منحوس کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔"

"جی نہیں۔ اگر بکرے دنیا کو سدھا جاتے تو آپ کو گوشت ضرور مل جاتا۔ وہ آج سب کے سب زندہ و سلامت ہیں۔"

"بکومت"۔ اس نے غصہ میں کہا۔ "آخر بات کیا ہے؟"

"جی آج ہڑتال ہے۔"

"کیوں؟"

"جی پتہ نہیں۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ مسلم لیگ ——"

"اچھا جاؤ"۔ اور وہ تلخ لقموں کے ساتھ ساتھ آج کل کی سیاست کے متعلق سوچنے لگا۔ چند مہینوں سے دفتر۔ رہگذر اور گلیوں میں ایک ہی طرح کی باتیں سن کر وہ اس بات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ اور اب تو اُسے یقین سا ہو چلا تھا۔ کہ ہندو اصل میں اُن کے سخت دشمن ہیں اس لئے وہ ان سے بہت کم ملتا۔ اور آج وہ گوشت نہ ملنے پر بھی نوالے اپنے حلق سے نیچے اتارے جاتا تھا اس لئے کہ اس کے لئے یہ خبر کافی تھی کہ ہڑتال کسی مسلم سیاسی پارٹی نے کروائی تھی۔

کھانا کھا چکنے کے بعد نوکر کو آواز دے کر وہ خود ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانہ تک چلا گیا۔ جب وہ واپس مڑا۔ اس نے میز پر پڑا ہوا لفافہ دیکھا۔ اس کے پتہ کو وہ خوب جانتا تھا دو سال سے وہ اس پتہ کو دیکھ رہا تھا۔ اور اسے یہ دیکھ کر ہمیشہ خوشی ہوتی۔ بے انتہا خوشی۔ لفافہ کو دیکھ کر ہمیشہ ہی اس کا دماغ چند لمحوں کے لئے ماضی میں غوطہ لگا کر اُبھرتا۔ اور اس طرح سے وہ اپنے ماضی کو کبھی نہ بھول سکتا۔ آرام کرسی پر لیٹے ہوئے اس نے لفافہ کو ہاتھ میں لیا اور کھولنے سے پہلے اس نے اپنا نام سجاد پڑھا۔ وہ ان شفیق ہاتھوں کو خوب جانتا تھا جنہوں نے اُس کے نام کو اُس کی نظروں میں بڑا خوبصورت بنا دیا تھا اُسے یاد آ گیا۔

آج سے دس برس پہلے اُسے معلوم ہوا تھا۔ کہ وہ یتیم ہے اُس کی ماں اُس کے پیدا ہونے کے چھ ماہ بعد فوت ہو چکی تھی۔ یہی اس کی بد نصیبی کی کافی دلیل تھی۔ اُس کی بڑی بہن اُس سے دس سال بڑی تھی۔ اُسے یاد آیا کہ آج سے پندرہ برس پہلے جب اُس کی بہن کی شادی کو دو سال گزر چکے تھے۔ تو اُس نے اپنے باپ سے بھی ہاتھ دھو لیا۔ اب اُس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ اس کی پیار کرنے والی بہن نے اُسے پاس رکھ لیا اس کا بہنوئی بھی اس سے بڑی محبت کرتا لیکن اس کی بہن کے سسرال کبھی بھی اس سے پیار نہ کرتے۔ بلکہ ہمیشہ اسے کسی نہ کسی طریقہ سے تکلیف دینے کی کوشش کرتے لیکن بہن نے ان کے طعن سننے کے بعد بھی اس کو اپنے سے کبھی جدا نہ کیا اور اسے سکول میں داخل کروا دیا بدقسمتی سے اُس کی بہن کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس لئے وہ اسے اور زیادہ چاہنے لگی۔

دن گزرتے گئے اور وہ بڑا ہوتا گیا۔ آخر اس نے دسویں جماعت پاس کر لی۔ وہ اس سے زیادہ تعلیم نہ دلوا سکی اور اپنے خاوند کی وساطت سے ہی اُسے شہر میں کلرک لگوا دیا۔ دو سال سے وہ دوسرے شہر میں آ گیا تھا۔ کبھی کبھی چھٹی لے کر وہ بہن سے ملنے کے لئے چلا جاتا۔ اُس نے آج تک سوائے اپنی بہن کے اور کسی عورت کے متعلق نہ سوچا۔ وہی اُس کی شفیق ماں۔ مہربان بہن اور سب کچھ تھی۔ اس کی خوشی اس کی خوشی ہوتی۔ وہ سوچتا بہن کا رشتہ بھی کتنا پاکیزہ اور خالی از فریب رشتہ ہے وہ بھائی کے لئے کیا کچھ کرتی ہے۔ اُس نے دل میں پکا ارادہ کیا۔ کہ وہ اپنی بہن کو جس نے اتنی مصیبتوں سے اُسے پالا تھا معاوضہ دے گا۔ لیکن بہن کو معاوضہ کیا دیا جا سکتا ہے۔ شاید دنیا کی کوئی چیز اس کے پیار و خلوص اور محنت کے احسان کا بدلہ نہ چکا سکے —— چھ ماہ ہوئے اُسے معلوم ہوا تھا۔ کہ اس کی بہن کو خدا نے لڑکا عطا کیا ہے یہ خبر سن کر وہ کس قدر خوش ہوا تھا۔ یہ اس کا دل ہی جانتا ہے۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ وہ سارے گھر میں ناچتا پھرے۔ کیونکہ اس کی بے انتہا دعاؤں کے عوض خدا نے اسے بھانجہ دیا تھا۔ اس دن اس نے نوکر کو دو روپے دے کر بے حد فراخدلی کا ثبوت دیا۔ وہ اتنی بڑی رقم دیکھ کر چونک سا گیا تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے اس کی حیرت کو دور کرنے کے لئے کہا تھا۔

"یہ منہ پھاڑے میری طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ جا کر مٹھائی کھالو۔"

اور پھر اس نے اپنے مختصر دوستوں کو ایک چھوٹی سی پارٹی دی۔ وہ سب حیران تھے۔ کہ اتنی چھوٹی سی بات اسے اس قدر خوش کیسے کر سکتی ہے۔ آخر سب بھائی بہنیں رکھتے ہیں لیکن وہ سجاد کی خوشی کو سمجھ نہ سکتے تھے —— اُس نے دفتر میں چھٹی کے لئے درخواست دی لیکن چھٹی نہ مل سکی کام زیادہ تھا ——

لفافے کو پھاڑتے ہوئے اُس کا چہرہ اندرونی خوشی سے چمک رہا تھا خط اس کے سامنے تھا۔ اس نے پڑھنا شروع کیا

پیارے بھائی!

بہت دنوں سے خط نہ لکھ سکی۔ وجہ خاص ہی تھی۔ پہلے تو ننھا بیمار تھا۔ پھر چند دنوں سے شہر میں جو حالت ہے وہ تم سے چھپی نہ ہوگی۔ اخبار کسی نہ کسی حد تک تمہیں خبریں پہنچاتے ہی رہتے ہوں گے لیکن جو آنکھ دیکھتی ہے۔ لکھا نہیں جا سکتا چند دنوں پیشتر ہندو مسلمان سب اکٹھے رہتے تھے۔ ایک جا اُٹھتے بیٹھتے اور ہر کام ایک دوسرے کی رائے لئے بنا نہ کرتے۔ لیکن آج وہی ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے ہوئے ہیں میں سوچتی ہوں۔ کیا یہ انجام سے بالکل بے خبر ہیں۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ آخر انہوں نے یہیں رہنا ہے —— لیکن آج وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے بیٹھے ہیں۔ یہ دشمنی مار پیٹ یا گالی گلوچ سے سیر نہیں ہوتی۔ صرف روٹھ جانے تک محدود نہیں —— تم نے کبھی دیکھا ہے۔ کہ جب دو فرقوں کے دلوں میں کینہ بھر جاتا ہے۔ تو وہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لئے کیا کیا ڈھنگ نکالتے ہیں —— ؟ عجیب و غریب ڈھنگ۔

کیا تم نے کبھی آگ کے دیوتا کو سرخ زبان نکالے ہوئے بستیوں کو نگلتے دیکھا ہے ؟ کیا تم نے آبادی کو بربادی میں تبدیل ہوتے ہوئے۔ خاندانوں کو اُجڑتے دیکھا ہے ؟ یہ میں دیکھ رہی ہوں۔ چند دنوں سے یہاں یہی ہو رہا ہے۔ اپنے ہی محلوں میں اپنی ہی دیواروں سے ملحق دیواروں کو آگ لگا دی جاتی ہے وہ نہیں دیکھتے کہ اپنے ہی چراغ سے وہ اپنے ہی گھروں کو جلا رہے ہیں اور کبھی یہ بھی دیکھا یا سنا ہے کہ تم آرام و چین سے سوئے پڑے ہو اور دفعتاً تمہارے قریب ایک بم پھٹ جائے۔ اور تم حقیقت کو جاننے سے پیشتر ہی موت کی وجہ معلوم ہونے سے قبل ہی اس دنیا میں نہ رہو؟ —— شہر کا ہر فرد راہ میں ایسے چلتا ہے گویا موت اس کا تعاقب کر رہی ہو۔ اور سب سے زیادہ انتہائی کمینگی یہ ہے۔ کہ وہ جب ایک دوسرے کو اکا دکا دیکھتے ہیں۔ تو چھرا گھونپ دیتے ہیں۔ بیچارے راہ چلتے کو آن واحد میں اس کی زندگی کے راہ سے بھی گم کر دیتے ہیں۔ تم نے کبھی اسطرح سے تہذیب کو اپنے ہی ہاتھوں خودکشی کرتے سنا ہے ؟

بیچاری ہندو عورتیں مجھ سے ملتی ہیں۔ تو اس فساد کی ہولناکیاں سناتی ہیں۔ اور جب مسلمان ملتی ہیں۔ تو وہ اس کو بُرا بھلا کہتی ہیں میں حیران ہوتی ہوں۔ کہ آخر قصوروار کون ہے ؟ اور اس کا انجام کیا ہوگا —— بربادی۔ قحط اور وبا —— صدیوں سے بسا ہوا شہر کھنڈروں میں تبدیل ہو رہا ہے۔ آخر کیوں ؟

شکر کرتی ہوں کہ دوسرے فرقہ کے لوگ میرے ایسے ہی دوست ہیں جیسے مسلمان —— سنا ہے چند دنوں تک تمہارے بھائی کی تبدیلی ہو جائے گی۔ ابھی نہیں جانتی کہ کہاں —— دوسرے شہر میں پہنچ کر اگلے خط میں تمہیں سب کچھ تحریر کروں گی دُعا کرو۔ اس فساد کی آگ کو خدا جلد سے جلد ٹھنڈا کرے

تمہاری مخلص بہن سکینہ

خط پڑھ کر اس کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وحشت و بربریت کے دیوتا اپنے بھیانک قہقہوں سے فضا کو چیرتے ہوئے آ کھڑے ہوئے۔ اُف! کس قدر بربادی اُس کے منہ سے نکلا چیختے چلاتے بچے۔ بے نقاب عورتیں۔ دنیا کا بدترین ظلم۔

لیکن پھر اُسے اُس پارٹی کا خیال آگیا۔ جس کا وہ رکن تھا اس کے مقصد کے متعلق اُس نے سوچا پھر کہا ہُوا۔ کسی اعلیٰ مقصد کے لئے جانیں دینا ہی پڑتی ہیں ۔۔

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اُس نے زیرِ لب دُہرایا۔ اور پھر مہاتما گاندھی نے بھی تو کہا ہے۔ کہ پاک ہونے کے لئے آگ میں سے گذرنا پڑتا ہی ہے۔ اور پھر اُس نے اُس حوصلہ مند پرندے کی طرح اپنے آپ کو دلاسا دے لیا۔ جو کہتا تھا۔ اگر میرے نشیمن کو بجلی نے جلا کر راکھ کر دیا ہے تو کیا ہُوا۔ میں اس راکھ پر نئے آشیانہ کی بنیاد رکھوں گا——

لیکن پھر اس کے خیالات نے پلٹا کھایا۔ اور کہا کیسی لیڈر نے اس کشت و خون کی اجازت نہیں دی۔ اس عمل سے تو ہم بجائے آزادی لینے کے اور غلامی میں جکڑ دیے جائیں گے۔

اور اسی طرح جب وہ رات کو لیٹا تو اس کی بہن کی کھینچی ہوئی تصویر بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ اور باوجود ہزار کوشش کے وہ اُس رات سو نہ سکا۔

اس واقعہ کو دس دن گذر گئے تھے۔ اُسے دس دن کی چھٹی مل گئی۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا۔ کہ اس کی بہن آج کل کہاں ہے۔ وہ ہر روز اُس کے خط کا انتظار کرتا۔ لیکن اسے کوئی خبر نہ مل سکی۔ کئی بار بار بُرے بُرے خیالات اس کے دماغ میں آئے کہیں ان کے علاقہ میں فساد نہ ہو گیا ہو۔ اور پھر اُسے یہ تلخ سا خیال آنے لگتا۔ کہ اس کی بہن بے یار و مددگار اپنے چھوٹے سے بچے کے ساتھ مصیبتیں جھیل رہی ہے۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اور وہ بارگاہِ خدا میں سر بسجود ہو کر گھنٹوں دعائیں مانگتا رہتا۔ کہ خدایا وہ محفوظ رہے۔ اس کی زندگی کے لئے اگر میری جان قربان ہو سکے تو وہ حاضر ہے——

اور بعد میں وہ یہ بھی سوچ کر مطمئن ہو جاتا کہ اس کا فکر بے معنی ہے۔ یقیناً ان کی تبدیلی ہو چکی ہے۔ اور کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ اسے خط نہیں لکھ سکی۔

ایک دن اسی ادھیڑ بُن میں بیٹھا تھا۔ کہ اس کے دو دوست آ گئے۔

"کیا کر رہے ہو؟" ایک نے آتے ہی پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ آئیے بیٹھئے۔ میں بھی اکیلا گھبرا گیا تھا۔" اس نے چارپائی پر ان کے بیٹھنے کے لئے جگہ بناتے ہوئے کہا۔

"تم تو خدا جانے کہاں چھپے رہتے ہو؟ آخر اس عزلت نشینی کی کوئی حد بھی ہو۔" دوسرے نے کہا۔

"کوئی خبر سناؤ!" سجاد نے سوال سے لاپرواہ ہو کر کہا

"تازہ خبر تو کوئی نہیں۔ ہاں ہم دونوں نے ایک پروگرام بنایا ہے۔ اگر تم منظور کرو تو——"

"کیا تجویز ہے؟" سجاد نے خشک سے لہجہ میں پوچھا۔

"آج کل تم چھٹی پر ہو۔ ہم نے بھی تین دن کی چھٹی لے رکھی ہے۔ کیا اچھا ہو اگر ہم حیدر کے ہاں چلیں۔ اُس نے کئی بار بلایا ہے لیکن کبھی بھی موقع نہیں ملا۔"

"میرا دل نہیں چاہتا۔"

"تمہارا دل تو کبھی بھی نہیں چاہتا۔ اس دفعہ تو ہم تمہیں ضرور لے چلیں گے۔"

"کوئی زبردستی ہے؟"

"بالکل"

"تو کتنے جائیں گے ہم؟"

"تین۔"

"تین نمبر تو منحوس ہوتا ہے۔"

"تم پڑھ لکھ کر بھی ایسی باتیں کرتے ہو—— اب تمہارا علاج کون کرے۔" سعید نے جل کر کہا۔

اور اس طرح سے وہ تینوں دوست دوسرے دن گاڑی میں سوار ہو کر حمید کے ہاں پہنچے۔ اُس نے ان کا پُرجوش استقبال کیا۔ سارا دن گپیں اور تاش چلتی رہی۔ شام کو وہ شہر کے مشہور باغ میں سیر کرنے کے لئے گئے۔ باغ میں بیٹھے ہی ہوں گے کہ ہر راہ چلتے کے قدم تیز ہو گئے۔ ہر شخص کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار پیدا ہو گئے۔

"آخر بات کیا ہے" حمید نے آگے بڑھ کر کسی سے پوچھا

"شہر میں فساد ہو گیا ہے۔"

"فساد؟" چاروں کے منہ سے ایک دم نکلا۔

تیز تیز قدم رکھتے چاروں دوست گھر میں پہنچے۔ ان کا گھر بھی شہر میں تھا۔ گھر کی عورتیں گھبرا رہی تھیں۔ ایک ہی گھنٹہ میں ان کو دوسرے رشتہ دار کے ہاں پہنچا کر وہ انتظار کرنے لگے۔ کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ بہت رات گئے۔ ان کو نیند آ گئی۔ کیونکہ شہر میں اب مکمل امن تھا۔ اور کرفیو لگ چکا تھا۔ وہ مشکل سے سوئے ہوں گے۔ کہ ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ وہ بڑبڑا کر اُٹھے۔ چھت پر سے دیکھا۔ قریب ہی ایک گھر سے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ سجاد کے کانوں میں عورتوں اور بچوں کی دلدوز چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اُس نے کانوں پر انگلیاں رکھ لیں لیکن آنکھوں کو بند نہ کر سکا۔ اور آگ کے لہراتے ہوئے سنہری جھنڈے لہراتے ہی رہے۔ حیدر کا خون جوش کھانے لگا

"ہمیں اُن کی مدد کرنا چاہیئے۔" اُس نے ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یقیناً" دونوں نے کہا۔ اور سجاد نے بھی چند منٹ سوچ کر زیر لب کہا۔ یقیناً۔ اور کرفیو کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ چاروں نوجوان گلی میں آ گئے۔ اور آن واحد میں اس جگہ پہنچ گئے جہاں آگ کے شعلے زبانیں نکال نکال کر دیکھنے والوں کا منہ چڑا رہے تھے لوگ گھبرا گھبرا کر گھروں سے باہر نکلے آتے تھے۔ ان میں عورتیں اور معصوم بچے جن کے چہرے پر مردنی چھا رہی تھی۔ موت سے بچنے کے لئے آخری کوشش کر رہے تھے۔ اس سے کچھ دور سجاد نے ٹوٹی ہوئی دیواروں کو بھی دیکھا۔ جہاں بم پھٹا تھا اور اس کے قریب ہی تڑپتی ہوئی لاشوں کو بھی ـــــ وہ لاشیں جو اپنا کوئی نہ کوئی عضو کھو چکی تھیں۔ اور ان کے جسم اس طرح چکنا چور ہو رہے تھے۔ جیسے کسی نے آسمان پر سے انہیں زمین پر پٹخ دیا ہو۔ ایک چیختے ہوئے پانچسالہ بچے کو بھی دیکھا جس کے ہاتھ کٹ چکے تھے۔ اس کا خون کھولنے لگا۔ انتقام کی آگ نے اس کے دل و دماغ عقل کو آن واحد میں جلا کر بھسم کر ڈالا۔ اب وہ بدلہ لینا چاہتا تھا اس شخص سے نہیں جس نے بم پھینکا تھا۔ بلکہ اُس قوم سے جس نے یہ کام کیا تھا۔ یہ بھیانک جذبہ اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ یہ شعلہ تھا جس نے اُٹھ کر اس کے پرانے اصولوں کو جلا ڈالا عاجزی و انکساری کا فرشتہ قہر کا دیوتا بن گیا۔ اب اسے یہ بھی یقین ہو گیا۔ کہ اس کی بہن کو ضرور اسی قسم کے فساد میں نقصان پہنچا ہے اسی لئے وہ خط نہ لکھ سکی۔ اب وہ صرف اپنی بہن کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔

دوسرے دن اس نے اپنے دوستوں اور محلے والوں کے ساتھ مل کر سکیم بنائی کہ رات کو دو دو آدمی گلیوں کے راستہ سے جا کر اس موڑ پر اندھیرے میں جمع ہو جائیں جہاں دوسرے فرقہ کے لوگ بستے ہیں۔ اور پھر بعد میں ایک دم ہلہ بول کر ان کے مال و اسباب کو لوٹا جائے۔ مردوں کو قتل کر دیا جائے۔ اور گھروں کو آگ لگا دی جائے۔ سکیم مکمل کرنے کے بعد وہ مطمئن سا ہو گیا اور جب رات ہوئی۔ تو وہ پولیس سے بچتے بچاتے محلے میں پہنچ گئے اور ایک دم ان پر ہلہ بول دیا۔ بیچارے لوگ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ ایک دم چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ انہوں نے بیدردی سے ہر شخص کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کے ہاتھ سے عورتیں اور بچے بھی نہ بچ سکے۔ ان کے ابلتے ہوئے دماغوں نے جو کچھ کرنا تھا کر ڈالا ـــــ اور چند گھنٹوں کے لئے وہاں پر "جنگل کے قانون" کا راج ہو گیا۔ حیدر اور وہ دونوں ایک گھر میں داخل ہوئے۔ وہ نہیں جانتے تھے۔ کہ باقی دو دوست کہاں ہیں اندھا دھند وہ کام کئے جا رہے تھے دروازہ پر ایک عورت نے چلا کر کہا

"ہم مسلمان ہیں"

"جھوٹ بکتی ہو" حیدر نے کڑک کر کہا۔ مکان میں ہر طرف اندھیرا تھا۔

"ختم کر دو اسے" سجاد دور سے چلایا۔

حیدر کی چمکتی ہوئی تلوار عورت کے سر پر پڑی اور وہ وہیں گر گئی۔ اس کی لاش کے اُوپر سے پھلانگتے ہوئے وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ چارپائی پر ایک ننھا سا بچہ لیٹا رو رہا تھا۔ اُس کو دیکھ کر سجاد کو اپنا بھانجا یاد آ گیا۔ اُس نے حیدر کے اُٹھے ہوئے

ہاتھ کو روک لیا اور خود آگے بڑھ کر بچے کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور پھر اسی طرح سے وہ پچھلے دروازہ سے نکلنے لگے۔ سانقہ کے مکان میں آگ لگ چکی تھی۔ اُس کے شعلے اس گھر کو بھی روشنی دے رہے تھے لاش کے قریب سے گذرتے ہوئے سجاد نے لاش کو دیکھا "سکینہ" کہہ کر وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اور اس کی پھٹی پھٹی سی آنکھیں اُس کو کتنی دیر ہی گھورتی رہیں۔ اُس کا دماغ ایسے چکر میں پھنس گیا۔ جیسے بھنور اُس کو گھمائے جا رہا ہو۔ حیدر نے اس کا بازو پکڑا اور اُسے پچھلے دروازہ سے باہر لے آیا۔ اور پھر جیسے مشین کی طرح وہ پولیس اور لوگوں سے بچتا بچاتا حیدر کے گھر آ گیا۔ لباس تبدیل کر کے وہ گاڑی میں بیٹھ گیا اور بغیر یہ سوچے ہوئے کہ وہ کیا کر رہا ہے وہ دوسرے دن اپنے گھر میں تھا۔ اور جب اُس نے گھر میں داخل ہو کر بچے کو بستر پر لٹایا۔ تو نوکر نے اس کے ہاتھ میں لفافہ دیا۔ اس کی نظریں پتہ پر جم گئیں۔ اور وہ تقریباً پندرہ منٹ اس کو پاگلوں کی طرح گھورتا رہا پھر جلدی سے اُس نے لفافہ کو پھاڑا اور پڑھا اُس کی بہن نے اپنے تبادلہ کے متعلق لکھا تھا کہ وہ اسی شہر میں تبدیل ہو کر جا رہے ہیں جہاں سے وہ آیا تھا۔ اور یہ کہ وہ چند دنوں کے لئے اپنے ہندو دوست کے ہاں ٹھہر گئے ——اور یہ بھی لکھا تھا کہ اب وہ اُن سے آ کر مل سکتا ہے——

اس نے ایک زبردست گھناؤنا سا قہقہہ لگایا—— "میں تمہارے پاس پہنچ گیا بہن۔ اور ننھے کو بھی دیکھ لیا—— تمہارے بلانے سے پہلے ہی——"

وہ اب یہی الفاظ تھے جو وہ بار بار کہتا تھا۔

بالآخر پولیس سراغ لگاتے لگاتے حملہ آوروں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ بم مار آگ لگانے والے اور چھرا گھونپنے والے متعدد آدمی ہندو مسلمان اور سکھوں سے گرفتار ہو کر سزایاب ہوئے، سجاد کے دوست تو جیل میں ہیں لیکن سجاد پاگل خانہ میں ہے کیونکہ اُس کا دماغ اس صدمہ سے ماؤف ہو گیا ہے۔ اب اس کو کچھ یاد نہیں سوائے اس کے اور وہ کچھ نہیں کہتا کہ "بہن! میں نے ننھے کو بھی دیکھ لیا اور—"

غزل

فصلِ گل آئی نسیمِ مشکبار آنے لگی
یادِ یار آنے لگی۔ بے اختیار آنے لگی

جگمگا اٹھا چمن کا گوشہ گوشہ حسن سے
بوٹے بوٹے میں نظر تصویرِ یار آنے لگی

صبحدم یہ کون نکلا خوابگاہِ ناز سے
ہر طرف سے موج بوئے خوشگوار آنے لگی

وہ سراپا بوئے گل پہلو میں آئے یا نہ آئے
اب تو میری سانس میں خوشبوئے یار آنے لگی

کچھ نہ پوچھو حال کیا تھا عندلیبِ زار کا
جس گھڑی سوئے قفس بادِ بہار آنے لگی

میری امیدیں جو مردہ ہو چکی تھیں اے جلیل
ان کو گلشن کی ہوا پھر سازگار آنے لگی

——جلیل قدوائی

جنرل مرچنٹ ڈائیر اینڈ میڈیکل سٹور

پنجاب میں انگریزی ادویات کی بہم رسانی کا ایک نیا ادارہ

دس لاکھ روپیہ کے سرمایہ سے ایک لمیٹڈ کمپنی

کا قیام عمل میں آ رہا ہے پنجاب میں ہماری کوئی ایک بھی ایسی کمپنی نہیں تھی جو انگریزی ادویات کی تھوک تجارت کا کاروبار کر رہی ہو۔ اس اہم ترین ضرورت کے پیش نظر اس پر منفعت تجارت کا آغاز کیا جا رہا ہے جنرل مرچنٹ ڈائیر اینڈ میڈیکل سٹور یورپ و امریکہ کی انگریزی ادویات کی بہم رسانی کے علاوہ جنرل مرچنٹ ڈائیز کے بعض ضروری شعبوں کا تھوک کاروبار کرے گی۔

اس کمپنی کی بنیاد پنجاب کے اولوالعزم تاجر شیخ عبدالمالک آف مالو شو کمپنی (رجسٹرڈ) مرکز نال شاپ لاہور) اٹھا رہے ہیں۔ جو کاروبار کی کامیابی کی ضامن ثابت ہوگی۔

جو صاحب ثروت اس کاروبار کی ڈائرکٹریٹ میں حصہ لینا چاہتے ہوں یا اپنا سرمایہ کسی منافع بخش کاروبار میں لگانا پسند فرماتے ہوں وہ اس سلسلہ میں پتہ ذیل پر خط و کتابت کریں۔

جو صاحب اس تجارت سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ ہم سے ملیں۔

ارشد رشید منیجر مالو شو کمپنی۔ حاجی بلڈنگ آبکاری روڈ لاہور

(بقیہ صفحہ ۱۲)

ابتدائی تفتیش کے موقع پر میں نے کوئی بیان نہ
ا۔ جب جیوری اور جج کے سامنے آخری فیصلہ کے لئے
ں پیش ہوا تو میں نے اپنی رام کہانی سنائی، جس پر جج نے
دمہ کی کاروائی روک کر اُس اٹاچی کیس کو طلب کیا۔ جس میں
ری رہائی کا سامان بند تھا۔ مگر میری بدقسمتی دیکھئے کہ باوجود
دی تلاش کے وہ اٹاچی کیس نہ ملا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی
ہ گیر اس غیر آباد جگہ میں آیا اور اٹاچی کیس لے گیا۔ وہ یادداشت
ور تصویریں اُس نے یقیناً پھینک دی ہونگی۔ اگر وہ چاہتا
و پولیس کے دفتر میں بھجوا دیتا یا اُس اٹاچی کیس کی چوری کے
جرم میں دو چار ہفتہ کی قید برداشت کر کے میری جان بچا
سکتا تھا مگر میری اتنی اچھی قسمت کہاں تھی۔ یہ ہے اصل حقیقت
اور اب اس سچ کی پاداش میں مجھے پھانسی پر لٹکنا ہوگا۔
جج۔ جیوری اور دُنیا میری کہانی پر اعتبار نہیں کرتی۔
کیونکہ وقت ضائع ہو چکا ہے، اب پھانسی پر لٹکنا میری
قسمت میں لکھا ہے، لیکن یہ بہت دُکھ بھری بات ہے کہ
انسان بلا کسی وجہ کے پھانسی پر لٹکے۔ ایک ایسے قتل کے
الزام میں جو اُس سے کبھی سرزد نہیں ہوا۔"

اس کہانی کو پڑھ کر میں اپنا واقعہ بھول بیٹھا
ہوں۔

(ترجمہ)

یوسف حسن

نقاشِ فطرت حضرت ایم اسلم کے حیات افروز ناول

آخری رات:۔ بے پردگی کے خوفناک نتائج دلچسپ ناول کی صورت میں ۴ روپے

شامِ غریباں: غریبوں کی دکھ بھری زندگی کا نقشہ دلکش رومان کے ساتھ ۴ روپے۔

رام کلی:۔ دیہاتی الھڑ حسینہ اور اندھے کی داستانِ محبت۔ ۳ روپے۔

شمسہ: تہذیب فرنگ کی ایک فریب خوردہ حسینہ کی زندگی کے المناک نتائج ۵ روپے۔

شام و سحر:۔ ایک امیر خاندان کے عروج و زوال کی دلپذیر عبرت انگیز داستان ۵ روپے

بیتی باتیں:۔ ایک نوخیز تعلیم یافتہ حسینہ کس طرح ہر مشکل کا مقابلہ کر کے اپنی حیات نو کیلئے صبح و شام پیدا کرتی ہے۔ ۳ روپے۔

رقصِ بہار:۔ آزاد اسلامی معاشرت کا مقابلہ مغربی متعفن تہذیب سے کیا گیا ہے قیمت ۳ روپے

حسنِ سوگوار:۔ ایک وطن پرست چینی محبوبہ کے دلچسپ رومان کے ساتھ ساتھ چین و جاپان کی آویزش کی خونچکاں داستان قیمت ۲ روپے

ہیر رانجھا: سرزمین پنجاب کی زندہ جاوید داستانِ عشق ۲ روپے

طلسمِ سامری:۔ زار روس کے خونچکاں مظالم کی داستان۔ ۳ روپے

خط کا جواب: یہ خطوط نہیں بلکہ تیر و نشتر ہیں۔ ۱/۴ روپے

رین نظارے: دلکش افسانے جو چاندنی راتوں میں مست و رنگین جوانی کی یاد دلاتے ہیں۔ ۸/۴ روپے

رازِ نیاز (با تصویر) ایک طوائف کا دلآویز رومان جس کا ہر لفظ جوانی اور شباب کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ قیمت ۵ روپے

اشکِ ندامت: ایک شریف زادی کے ایکٹرس بننے کا نہایت ہی عبرتناک انجام ہے

فریادِ خاموش: مخلوط تعلیم کی برائیاں اور ایثار و قربانی کی تحریک ۵ روپے

جہنم: زندگی عمل سے بنتی ہے اور بگڑتی ہے اس نظریہ کی تفسیر اس دلچسپ ناول میں پڑھیئے۔ ۴ روپے

شفق:۔ کالج لائف کا ایک دلکش اور بے حد ہولناک رومان قیمت ۲ روپے

قاتل:۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ آپ افسانوں کی دنیا میں حرکت کر رہے ہیں۔ بے حد دلچسپ ہے قیمت دو روپے آٹھ آنے

جامِ شکستہ:۔ غم و فراق کی بے چین کروٹیں اور یاس و حرمان کے مضطرب نالے ایک اچھوتی کتاب رنگین کی شکل میں گیارہ افسانے قیمت ۳ روپے ۸/۴

بادۂ گلرنگ:۔ گیارہ رنگین افسانوں میں سے ہر افسانہ عبرت کا مرقع اور درد کی تصویر ہے۔ قیمت ۱۲/۴

بچوں کے لئے دلچسپ کہانیوں کا سیٹ از ایم اسلم

کی دیگر زیر طبع کتب:۔ چشم تیلی۔ خراب خانہ ساز۔ چروڈن۔

تعزیر:۔ ابوالفضل صدیقی کا شاہکار ناول جس میں خیر و شر کی آویزش بڑے دلچسپ پیرایہ میں بیان کی گئی ہے قیمت ۴ روپے۔

یادِ ایام:۔ انتصار رتیو تنوی کا سنسنی خیز تازہ ناول جو تجزیہ کردار و جذبات کے لحاظ قابل قدر ہے قیمت ۳ روپے

الطاف کے نغمے الطاف مشہدی کے تازہ گیتوں غزلوں کا شاندار مجموعہ ۸/۴

ہر قسم کتابیں ملنے کا پتہ:۔ **دارالبلاغ** محمد نگر میو روڈ۔ لاہور (محصولڈاک بذمہ خریدار)

فیصلہ

شرقی خالدی

فریب کھانے سے فائدہ کیا بھلا وہ پاسِ وفا کریں گے
جنہیں مٹانے کا شوق ہوگا وہ دل کی تعمیر کیا کریں گے

ابھی تو نظریں اُٹھیں ہیں اُن پہ ابھی سے کیا فیصلہ سُنائیں
نگاہ و دل اپنی رائے دیدیں تو پھر کوئی فیصلہ کریں گے

کسی کو معلوم تک نہ ہوگا کہ تُم سے ہم کو تھی محبّت
کسی کو احساس تک نہ ہوگا کچھ اس طرح ہم وفا کریں گے

ذرا سی بے سرسری توجہ نظر کا ہلکا سا اک اشارا
پلٹ کے رکھ دُوں گا میں جہاں کو حضور اگر اعتنا کرینگے

یہ حسن و اُلفت کی شرح کیسی بغیر وجداں کے کیسا عرفاں
خرد کے سانچوں میں ڈھلنے والے جنوں پہ تنقید کیا کریں گے

تم اپنی حق ناشناسیوں کا ذرا کبھی خود ہی جائزہ لو
یہ رسم و راہ بھی نہ رہ سکے گی جو ہم کوئی فیصلہ کریں گے

تمہارے آگے کسی میں عرضِ بیاں کی ہمت نہیں یہ سچ ہے
زباں سے خاموش رہنے والے نگاہ سے التجا کرینگے

غمِ محبّت پہ ہر مسرّت نثار کر کے تو مطمئن ہیں
غمِ محبّت بھی ہم کو شرقی نہ راس آیا تو کیا کریں گے

مکتبۂ سلطانی کی جدید کتب
دل کے آنسو
رئیس احمد صاحب جعفری کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ آئینہ ہے ان ٹھوس حقیقتوں کا جن سے ہمیں روزمرہ زندگی میں دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان میں شیرینی بھی ہوتی ہے اور تلخیاں بھی۔ بعض اوقات یہی تلخیاں ہمیں خون کے آنسو رلاتی ہیں۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت
جھلکیاں
حضرت جمیر بیتابوری کے دل افروز افسانوں کا مجموعہ جن میں زندگی کی وہ تصاویر موجود ہیں۔ جو محبت بھرے دلوں کیلئے پیامی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ داستان حقیقت کا آئینہ ہیں۔ زبان شیریں۔ بیان پرکیف پڑھنے کے بعد زندگی کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ قیمت
دیول پلان کے بعد
عرش تیموری صاحب نے اس کتاب میں ہندوستان کے حالات کو عجیب انداز سے ترتیب دیا ہے۔ اس میں وضاحت سے دیول پلان سے برطانیہ کے مقصد اور ہندوستانی سیاسی جماعتوں کے مطالبات کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ ہے پُر اسرار انکشافات کا بیان نہایت دلکش اور پوری کتاب افسانہ کی طرح بیحد دلچسپ قیمت
گھروندے
عرش تیموری کے مقبول ڈراموں کا مجموعہ انمیں سے بیشتر ریڈیو سے نشر ہو کر پورے ہندوستان میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ ڈرامے بہترین کاملوں لطیف طنز اور کردار نگاری میں مشہور ہیں اور بیشتر مزاحیہ ہیں۔ جو آپ کو نہ صرف ہنسائیں گے بلکہ دعوت فکر بھی دینگے۔ چند ڈراموں کے عنوانات یہ ہیں۔ سوسائٹی، عورتیں، دو دوست، اس پاگل دنیا نے، آس پاس وغیرہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے
منجدھار
نادم سیتاپوری کے سماجی اور اخلاقی افسانوں کا بیش بہا خزانہ جس کے بہت سے افسانے ملک کے بلند پایہ ادبی رسائل میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ زبان سلیس اور بامحاورہ قیمت
سندیسے
نادم سیتاپوری کی وہ انمول تصنیف جس کو پڑھنے کے بعد سیاسی اور تاریخی زندگی بہت قریب نظر آتی ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔
ان سُنی
نادم سیتاپوری کی یہ ان سنی طنز نگاری کا وہ لافانی شاہکار ہے جس میں سماج کے جسم پر چٹکیاں لیکر تکلیف نہیں پہنچائی بلکہ بقول علامہ آرزو ٹھونکے دیئے گئے ہیں قیمت
تشنگی
رشید اختر صاحب ندوی کا بہترین ناول جس کو ایک مرتبہ پڑھنے کے بعد دوبارہ بھی ضرور پڑھیئے گا۔ یہ ناول اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور یہ ہندوستان کی سچی تصویر ہے۔ جہاں حسن روتا عصمت چیختی اور پارسائی نوحہ کرتی ہے۔ جہاں غریبوں کے دلوں کو روندا جاتا ہے اور امیروں کی نعش پر پاؤں رکھ کر رقص کرتے ہیں۔ قیمت چار روپے
بیل بوٹے
اُردو کے نادر انشا پرداز جناب مظفر حسین صاحب شمیم کے دلکش اور عام پسند مضامین اور افسانوں کا شاندار مجموعہ۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت
ان کے علاوہ مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی کی مشہور تاریخی نادلیں طلب فرمائیں۔ شوقین ملکہ، مفتوحہ فاتح، قیس و لیلیٰ، طاہرہ، جویائے حق کامل تین حصوں میں، ایام عرب، ماہ ملک، زوال بغداد
ملنے کا پتہ: سلطان حسین تاجر کتب ابراہیم رحمت اللہ روڈ، بمبئی نمبر ۳

فاسد مادہ کے بغیر
جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے
خون صاف رکھنا نہایت ضروری ہے
قدیم یونانی نظریہ کی تائید میں جب ڈاکٹر پیٹینکوفر پروفیسر دیانا یونی ورسٹی نے
فیصلہ کر لیا کہ مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے تو ایک دن انہوں
نے ایک عجیب و غریب مظاہرہ کیا۔ وہ کلاس کو پڑھا رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ
میں ایک ٹیسٹ ٹیوب تھی جس میں ہیضہ کے زندہ جراثیم موجود تھے، جو
ایک پوری رجمنٹ کو ہلاک کرنے کے لئے کافی تھے۔ ڈاکٹر نے ان سب
جراثیم کو نگل لیا، مگر اس خطرناک تجربہ کا نتیجہ سوائے ہلکی سی تکلیف کے اور
کچھ بھی نہوا، آخر کیوں؟ ہیضہ کے زندہ جراثیم نے ڈاکٹر کو ہلاک کیوں نہیں
کر ڈالا؟ صرف اس لئے کہ ڈاکٹر کا خون فاسد مادوں سے صاف تھا اور
یہی ڈاکٹر کا دعویٰ تھا۔
یقیناً جراثیم کو مارنا قطعاً غلط ہے اصل چیز جسم و خون کو فاسد مادوں سے صاف
رکھنا ہے۔ صافی اسی اصول کے پیش نظر تیار کی گئی ہے۔ یہ خون کو صاف رکھتی ہے
اور جسم کی قوتِ مدافعت کو مرض کے خلاف قوی رکھتی ہے،
قیمت فی شیشی ایک روپیہ
SAFI
THE GREAT BLOOD PURIFIER
Hamdard
صافی
Hamdard
ہمدرد دواخانہ دہلی
خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

ع سو بار دیکھنے کے قابل بنا دیا
جس کو فنا نہیں ہے وہ دل بنا دیا

سیّد فضل حسنین کی ایک زندہ جاوید پیش کش

فسانہ و مکالمے اور ہدایت کار سیّد فضل حسنین

موسیقی ظفر خورشید

گانے

(۱) شمس لکھنوی
(۲) رضی بنارسی
(۳) سیّد عرش حیدری دہلوی

دل

اداکاران:- نورجہاں، عبداللطیف (درویش) کمال، عوذری۔ پدھوا ڈوانی۔ آمنہ۔ ایم۔ اے خان۔ گیتا بوس۔ انیس خاتون۔ نوری بیگم۔ شرما۔ پریتما دیوی۔ زبیدہ وغیرہ۔

بھوپال۔ جبل پور و دیگر کئی مقامات پر کامیابی کے تمام گزشتہ ریکارڈ مات کر دیئے

سیّد حسنین کا آئندہ پروگرام

راستہ

جاری کردہ:- فضلی برادرس لمیٹڈ۔ رتن ولا ونسنٹ اسکائر دادر بمبئی

پورے پانچ سال کے بعد

جنگ کے ختم ہوتے ہی

لاکھوں عورتوں اور مردوں کا پسندیدہ عطر

سلون سینٹ کا اسٹاک آ گیا

وُہ عطر جس کی لاکھوں کروڑوں ہندوستانی خواتین شیدائی تھیں
وہ اعلےٰ ترین خوشبو جس کی ہندوستان کے کونہ کونہ میں دھوم تھی
جس عطر کی ایک ایک شیشی بلیک مارکیٹ میں دس دس روپے کو بھی میسر نہ آتی تھی
آج وہی عطر یعنی سلون سینٹ کی شیشی آپ مقررہ قیمت پر حاصل کر سکتے ہیں

اگر آپ خوشبو کے شیدائی ہیں

تو صرف ایک بار سلون سینٹ استعمال کر کے دیکھئے۔ آپ ہر عطر کے مقابلہ پر اسے ہر لحاظ سے بلند پائینگے۔ بڑی بہار آفریں خوشبو۔ آج کپڑوں میں لگائیے۔ اور ہفتہ بھر تک اسکی مہک کا لطف لیجئے۔ اگر آپکی بیگم صاحبہ عطر کی شوقین ہیں تو ایکبار اُنکے لباس کو سلون سینٹ سے مہکا دیجئے۔ اور اُسکے بعد سمجھ لیجئے۔ کہ آپ ہر حالت میں اس لاثانی عطر کے مستقل خریدار بننے پر مجبور ہو گئے۔ ایک شیشی سلون سینٹ کی قیمت تین روپے ہے۔ پتہ ذیل پر خط لکھکر بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لیجئے پارسل پر صرف نو آنہ محصول خرچ ہوتا ہے۔ (تین شیشی ایک ساتھ خریدنے پر محصول پارسل معاف)

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ۔ آر۔ ایم۔ بی ۳۱ دہلی

ٹیلیفون ۶۲۶۸

نقد و نظر

گنجہائے گرانمایہ } پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی ظرافت نگاری کے علاوہ سنجیدہ
نگاری میں بھی ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی صنف کی ایک
نادر تصنیف ہے ہمارا قومی سرمایہ چند ممتاز شخصیتوں پر مشتمل ہے۔
ان کی سیرتوں پر سیر حاصل تبصرے کرنا ان کی یادگاریں قائم کرنے کے
مترادف اور دوسروں کے لئے ترقی کی راہیں کھولنے کے سامان
پیدا کرنا ہے۔ یہ مجموعہ جو ۲۶۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے ۱۳ اصحاب کے
تذکرے پر مشتمل ہے۔ جن میں مولانا محمد علی، سر اقبال، سجاد حیدر
یلدرم، سر سلیمان، اصغر گونڈوی، سید محفوظ علی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔
پروفیسر رشید احمد صاحب کا طرز بیان عالمانہ ہوتا ہے زبان
سلیس اور مؤثر ہوتی ہے۔ ان اصحاب کے حالات ان کے قلم سے
پڑھنے کے دوران میں آپ پر زندگی کے درجنوں مسائل اور ان کے
عقدے وا ہو جاتے ہیں۔ ملک کو اچھے اور صحت بخش لٹریچر کی
ضرورت ہے یہ کتاب اس سلسلہ میں واقعی ایک گنجہائے گرانمایہ ہے
لائبریری بکس میں اس کتاب سے ایک اچھا اضافہ ہوا ہے۔
کتابت طباعت کاغذ سب قابل تعریف مجلد قیمت تین روپے
کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی سے طلب فرمائیے۔

تنقید کیا ہے؟ } از آل احمد سرور صدیقی ریڈر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی۔ حجم ۲۰۰ صفحہ مجلد
ملنے کا پتہ کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی
قیمت دو روپیہ۔
اس مجموعہ میں سات مضامین ہیں۔ پہلا مضمون یادگار حالی
دوسرا شبلی میری نظر میں۔ تیسرا اقبال کے خطوط۔ چوتھا موجودہ
ادبی مسائل ہیں۔ یہ اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ آل احمد سرور کا ہم سب
کو مشکور ہونا چاہئے کہ انہوں نے اردو کے تنقیدی لٹریچر میں ایک
اچھا اضافہ کیا ہے۔ یہ مضامین انٹرنس اور ایف اے کلاس کے
طلبا کے لئے کافی قیمتی مواد رکھتے ہیں۔ پانچواں مضمون ولیم سمرسٹ
ماٹم پر ہے یہ انگلستان کے ایک افسانہ نگار ہیں۔ ایسا مضمون اس
مجموعہ میں شامل نہ ہونا چاہئے تھا۔ یہ کسی رسالہ میں تو چھپ سکتا
ہے مگر ہمارے ملک کے تنقیدی لٹریچر کے کسی مجموعہ میں شامل نہ
ہونا چاہئے تھا۔ ساتواں مضمون "تنقید کیا ہے" پر لکھا گیا ہے۔
اس مضمون میں انگریزی کتابوں کے مطالعہ سے پیدا شدہ ذہنیت
ہر سطر میں جلوہ گر ہے اور یہ کچھ عجیب بھی نہیں جب ہمارے
ہاں اس مضمون پر مستند کتابیں نہ ہوں تو یوں ہی کام چلانا
پڑتا ہے لیکن اس تمام مضمون کو پڑھنے کے بعد بھی آپ نہیں بتلا
سکتے کہ تنقید کیا ہے؟ چھٹا مضمون ترقی پسند تحریک پر ایک
نظر ہے۔ یہ عنوان بھی غلط ہے۔ کیونکہ مضمون کے مطالعہ سے معلوم
ہوتا ہے کہ اس کا عنوان "ترقی پسند تحریک کی حمایت" ہونا چاہئے
تھا۔ آل احمد سرور صاحب نے بڑی کوشش کی ہے کہ ترقی پسندوں
کا زیادہ سے زیادہ پراپگنڈا کریں۔ یہ مضمون صرف ان کی حمایت کے
اعلان کے سوا کچھ نہیں۔ ان کی نظر میں افسانہ نگاروں میں صرف
چھ سات ترقی پسند افسانہ نگار ہی قابل ذکر ہیں۔ اگر تنقید اسی کا
نام ہے تو ہندوستان کے دو سو افسانہ نگار جن میں کم از کم دو درجن
تو ایسے ہیں جنہیں ہم ترقی پسند افسانہ نگاروں پر فوقیت دے
سکتے ہیں۔ ان کا ذکر تک نہ کرنا کہاں کا انصاف ہے آل احمد
سرور صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ باوجود اس زمانے دار مضمون
کے ترقی پسند ادیبوں نے انہیں اپنی صف میں شامل نہیں کیا اس
کے لئے لحاف، سلوار اور بو جیسی سندوں کی ضرورت ہے جس
سے آل احمد صاحب محروم ہیں۔ اور شاید ہمیشہ محروم رہیں۔
افسوس ہے کہ تنقید جیسے نازک عنوان پر ابھی تک کوئی
اچھی کتاب نہیں چھپی جتنے مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ وہ متفرق

مضامین کو یکجا کرنے کا نام ہے ان کے پڑھنے سے ناظرین کو تنقید کرنے کا کچھ طور طریقہ اور ڈھنگ معلوم ہو جاتا ہے یہ بھی غنیمت ہے مگر بعض ناقد جو بیر کا کبوتر بنا دیتے اور بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے لگتے ہیں۔ یا من ترا ملا بگوئم تو مرا حاجی بگو کے مصداق تعریف و توصیف کے طومار باندھتے ہیں۔ وہ تنقید کے نام کو رسوا کرتے ہیں۔ آل احمد سرور اگر ترقی پسندوں کی حمایت میں حد سے نہ بڑھ جاتے تو اچھا ہوتا۔ بہر حال تنقیدی مضامین کے مجموعوں میں یہ کتاب بھی غنیمت ہے۔

جام و مینا [ترتیب و تالیف]

نیرنگ خیال (لاہور) اردو کے مقبول ماہناموں میں سے ہے یہ رسالہ بیس سال سے قائم ہے اب سلسلہ شروع کیا گیا ہے کہ اس بیس سال میں جو چیزیں اس میں شائع ہوئی ہیں ان کا انتخاب بیس جلدوں میں شائع کیا جائے چنانچہ پہلی جلد میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے اس سلسلہ کی دوسری کڑی "جام و مینا" کی صورت میں شائع ہوئی ہے جس میں پیش لفظ حکیم محمد یوسف حسن صاحب ایڈیٹر نیرنگ خیال کا لکھا ہوا ہے پہلا افسانہ سرخ ساڑی مولانا عبدالمجید سالک کا لکھا ہوا بالائی طبقہ کی سوسائٹی کا ایک پلاٹ پیش کرتا ہے جناب سلطان حیدر جوش کا بیش کا سنبوسہ زمانہ جنگ کے پلاٹ کا ہے نغمہ روح منشی پریم چند کا افسانہ ہے جس کا نفسیاتی پہلو بہت بلند ہے۔ تصویر سید نصیر حیدر کا افسانہ ہے جس کا پلاٹ حسب معمول حسن و عشق پر مشتمل ہے۔ قلی شہزادہ خواجہ حسن نظامی کے قلم سے ہے غدر کے دردانگیز واقعات افسانہ کے انداز میں بیان کرنا ان کا حصہ ہے۔ ساما سکھ سدرشن کا افسانہ ہے اس مجموعہ میں سب سے طویل اور غالباً بہترین بھی ہے حق بہ حقدار نذر سجاد حیدر صاحبہ کا افسانہ شادی کے مسئلہ کے متعلق ہے مجرم کون ہے سالک صاحب کا موثر حزنیہ افسانہ ہے نوروز جناب ایم اسلم کا مغربی انداز کا افسانہ ہے بہن کی محبت جناب حامد اللہ افسر کا رومانی افسانہ ہے جناب بلقیس خاتون صاحبہ جمال کا افسانہ کرشمہ تقدیر مشرقی رنگ کا ہے آخری افسانہ حیات ثانی خود ایڈیٹر نیرنگ خیال حکیم یوسف حسن صاحب کا لکھا ہوا ہے افسانہ کا یہ مجموعہ دلچسپ بھی ہے اور کوئی افسانہ مبتذل بھی نہیں ہے
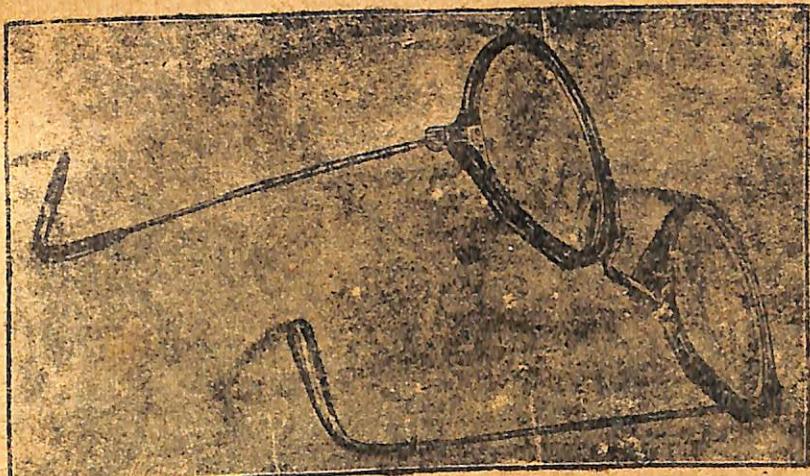
قائد اعظم محمد علی جناح اور دستور ساز اسمبلی، پاکستان!
سیاست حاضرہ کی بہترین کتابیں

نادہند فلم ساز کمپنیاں

"نقاش" کلکتہ اپنی ۲۰ اپریل کی اشاعت میں رقمطراز ہے:۔
بعض فلم کمپنیاں بلوں کی ادائیگی کے معاملہ میں ایسی خاموش ہیں کہ انہیں کسی عنوان سے کاروبار کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ ورنہ ایسی صورت میں ملک کی مایۂ ناز کمپنیاں بھی خواہ مخواہ بدنام ہوکر رہ جائیں گی اور یہی اچھی کمپنیوں کا مقصد ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ متعلقین صنعت ایسی دغاباز اور دشمن صنعت کمپنیوں کو یا تو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ یا انہیں ہمیشہ کے لئے اس طرح ختم کردیں کہ ان کے جراثیم پھیلنے نہ پائیں۔
اخبارات کے بلز جس دلیری کے ساتھ ان لوگوں نے دبا رکھے ہیں وہ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ انہیں معاف کیا جاسکے مجبوریاں سب کے ساتھ ہیں۔ حادثات پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ بلوں کی ادائیگی اور اس پر بحث بالکل الگ چیز ہے۔ کم سے کم ایک کاروباری ہونے کی حیثیت سے خطوط اور تقاضوں کا جواب دینا تو فرض سمجھنا چاہیئے۔ لیکن نہیں۔ ان کمپنیوں نے ادائیگی کے سلسلہ میں کوئی اقدام تو درکنار سرے سے جواب ہی اس طرح نہ دار دہے۔ کہ تقاضا کرنیوالا تقاضہ کرتے کرتے تھک جائے اور یہ غابازی سے دبی ہوئی رقم سے کلیلیں کریں۔ تو انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس قسم کی رکیک حرکتیں ان کے لئے خود مصیبت اور کاروبار...... کی تباہی کا سامان از خود مہیا کردیں گی۔ اور کم سے کم ان حلقوں میں ان کے ہر ہتھکنڈے ناکام رہیں گے جہاں ان کی دھوکہ بازیوں کا لمبا چوڑا ریکارڈ موجود ہے۔ اس لئے ایسی کمپنیوں کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ اپنے کاروبار کی خاطر اخبارات کے بلز اگر فوری طور پر ادا نہیں کرسکتیں تو کم از کم خط و کتابت کے ذریعہ اخبارات سے تعاون حاصل کریں۔ ورنہ بازار میں نام آتے ہی بری طرح ان کی مٹی پلید ہوکر رہے گی اور لازمی طور پر دس کی لالچ میں ہزاروں کا نقصان ہوگا۔"

معزز معاصر نقاش نے جو شکایت فلم کمپنیوں کی لکھی ہے وہ صحیح ہے۔ ہندوستان کی فلم کمپنیوں نے لاکھوں نہیں کروڑوں روپے اس تجارت سے کمائے اور کروڑوں ہی اس پہ برباد کئے لیکن انہوں نے اخبارات و رسائل کو زخم پہنچانے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ وہ اپنی کمپنی کی جملہ ضروریات پر فراخدلی سے خرچ کرتے ہیں لیکن پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کو روپیہ دینا اور بلوں کی رقوم ادا کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔

اس بدسلوکی کی اب عام شکایت ہے اور اگر اخبارات اور رسائل نے ایک قاعدہ کلیہ نہ بنالیا کہ وہ بغیر پیشگی اجرت کے کسی بھی فلم کمپنی کا اشتہار شائع نہ کریں گے، تو آئے دن اخبارات کو اس قسم کے حادثات کا شکار ہونا پڑے گا۔

ہم چاہتے ہیں کہ ایک بار تمام اخبارات اور رسائل ان رقوم کی فہرست اور نادہند کمپنیوں کے ناموں کو شائع کردیں، جنہوں نے اپنے بلز ابھی تک ادا نہیں کئے۔

(ادارہ)

نیرا اور نندا

حسن و عشق کی ایک دردناک کہانی

جس میں ششتی جے سنہا۔ ششی برن۔ اور روپ لبسنت کام کرتے ہیں۔ عنقریب کیپٹل سینما میں پیش کیا جائے گا۔ یہ فلم دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ امید ہے کہ کامیاب ہوگا۔

چندن

ساحر ہوشیارپوری
نریش کمار شادؔ